ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۹/ اپریل ۹۶ء

☆ اللہ کے سوا مسلمان کا کوئی معبود ہے نہ مقصود!

☆ سیکولر جمہوریت ایک دستوری فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں!

☆ حکومتی سطح پر عریانی اور فحاشی کی حوصلہ افزائی افسوسناک ہے!

حدیث امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

ہمارے بحران

اگر وطن عزیز کی پچاس سالہ سیاسی تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو یوں دکھائی دے گا کہ ہم نے یہ نصف صدی بحرانوں میں گزار دی اور قومی سطح پر سکھ کی گھڑیاں کم ہی نصیب ہوئیں۔ اہل علم' ارباب دانش' اصحاب اقتدار اور طبقہ خوشحال نے ایسا وتیرہ اپنائے رکھا کہ ایک بحران سے نمٹتے ہی دوسرے بحران کے لئے فضا تیار ہو جاتی اور اس بحران کو حل کرتے ہوئے تیسرے بحران کے لئے راہ ہموار کر دیتے۔ عوام بیچارے تو بس اچھے وقت کی آس لگائے اپنے اپنے اکابرین کے گن گاتے' ان کی شان دوبالا کرتے' ان کے کہنے پر بھاڑ جھونکتے زندگی کی دلدل میں دھنستے ہی چلے گئے اور آج جس جیون کے لئے انہوں نے سب کچھ بخوشی کیا اسی سے مایوس ہو کر ان میں سے بعض خودکشی کرتے' بچوں کا اپنے ہاتھوں قتل کرتے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے چھینا جھپٹی کرتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ کیسی صورتحال' کیسا وقت' کیسا انجام! ہر بحران پہلے کی نسبت زیادہ تشویش کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے نتیجے میں منظر عام پر آنے والی صورتحال سے ظاہر ہے۔ مذکورہ فیصلے پر حکومت' اپوزیشن' ماہرین قانون' وکلاء اور خود عدالت عظمیٰ کی جانب سے تشریحات' رائے اور بیانات کی اشاعت نے بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ کوئی حکومت کو سپریم کورٹ کا فیصلہ من و عن تسلیم نہ کرنے پر اکسا رہا ہے تو کوئی اپوزیشن کو سیاسی فضا مکدر کرنے کا الزام دے رہا ہے۔ کوئی گورنر جنرل غلام محمد سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کے زمانوں میں سیاسی و عدالتی نظام سے متعلق تلاطم خیز فیصلوں کی داستانیں بیان کر رہا ہے تو کوئی سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے متاثرہ جج صاحبان کو ان کی عدالتوں میں جانے سے روک دینے کا اعلان کر رہا ہے۔ کوئی فوج کے سربراہ کو اس فیصلے پر عمل درآمد کروانے کے لئے کہہ رہا ہے تو کوئی عوامی مارچ کے پروگرام کا اعلان کر رہا ہے۔ کہیں خواتین پولیس سے ٹکرا رہی ہیں تو کہیں پولیس عدالت عالیہ کے احاطہ کے اندر وکلاء کو مار پیٹ رہی ہے۔ غرضیکہ ایک عجیب ہیجانی صورتحال کا سامنا ہے۔ اخبار پڑھنے والے عوام الناس تو پھر بھی سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعض پہلوؤں کو کچھ نہ کچھ سمجھ پا رہے ہوں گے مگر ملک کے ۷۰ فیصد عوام تو سنی سنائی اور اڑتی اڑاتی باتوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں عمومی تاثر یہی ہے کہ زندگی تو پہلے ہی اجیرن بن چکی ہے اب عدل و انصاف کی رہی سہی امید بھی ختم ہوتے دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ انصاف کے حصول کے بارے میں پاکستان میں پہلے کونسی خوش فہمی پائی جاتی تھی تاہم ایک بھرم تو تھا ہی جس کی اب پردہ دری ہوا چاہتی ہے۔ عدل و انصاف کا انحصار صرف منصف کی رائے پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا بیشتر انحصار تو تفتیش' شہادت اور وکالت کے معیار پر ہوتا ہے جن کے بارے جتنا کم کہا جائے بہتر ہو گا۔ اب اگر جج صاحبان کی ذات کے بارے میں بھی عوام الناس کے ہاں اعتماد مجروح ہو جائے تو پھر زندگی میں کیا چاشنی باقی رہ جائے گی جو وطن سے محبت کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ ہمارے ہاں گروہ بندی (یاری) کا تصور نہایت "بلند" ہے۔ شخصی فرمانبرداری کے مقابلے میں دلیل' منطق' حقیقت' صداقت سب ہیچ سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طرفین کی جانب سے ہربیان' رائے اور تجزیئے کا انداز اس قدر شدید ہوتا ہے کہ معاملے میں تفہیم کی راہ دور دور تک نظر نہیں آتی بلکہ کنفیوژن اور ابہام صورتحال کو مزید بگاڑ دیتے ہیں۔ تاہم سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے بارے میں حزب اقتدار کے سوا پوری قوم کی متفقہ رائے یہی ہے کہ حکومت کو اس فیصلے پر خوشدلی سے عملدرآمد کرنا چاہئے' شاید کہ یہی ہمارے سیاسی بگاڑ کو سدھارنے کا نقطہ آغاز بن جائے۔ اس فیصلے میں حکومت کے لئے کتنی ہی سیاسی مشکلات یا قانونی پیچیدگیاں کیوں نہ ہوں خیر اسی میں ہے کہ اسے خلوص نیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے سے ایک روز قبل عجلت میں بعض جج صاحبان کو مستعفل کر دینے کے احکامات سے حکومت نے عوام کی نظروں میں اپنا کیس خود ہی کمزور کر دیا ہے۔ آخر کوئی خامی تو تھی جس کی پردہ پوشی کرنا مقصود تھا اب مزید پھرتی کہیں بھانڈا ہی نہ پھوڑ دے۔OO

قیمت : ۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

القدر

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت مت دو○ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوانا ہمارے ذمے ہے○ پس جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو تم اس کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ رہو○ پھر اسے کھول کر سمجھا دینا بھی ہمارے ذمے ہے○

(کہ قرآن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی شغف اور قلبی اشتیاق ہی کا یہ مظہر تھا کہ جب وحی کا نزول ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان مبارک الفاظ کو قلب و ذہن میں محفوظ کرنے کے خیال سے عجلت میں انہیں بار بار دہرایا کرتے تھے۔ رحمت خداوندی آپؐ کی اس مشقت کو کیونکر گوارا کر سکتی تھی! لہٰذا تسلی دے دی گئی کہ قرآن کے الفاظ آپ کے سینے میں محفوظ کرنا' اس کے علوم و معارف سے آپ کو روشناس کرانا اور آپ کی زبان سے دوسروں تک اس کا پہنچا دینا' سب ہمارے ذمے ہے)

ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم جلد ملنے والی چیز کو پسند کرتے ہو○ اور آخرت کو نظر انداز کرتے ہو○

(وقوع قیامت کے بارے میں تمہارا انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے' تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ تم دنیا کے پجاری ہو اور یہاں کا فوری نفع اور آسائش و سہولت تمہارے پاؤں کی بیڑی بن چکے ہیں' تم نقد کے گاہک ہو اور آخرت کے معاملے کو ادھار جان کر نظر انداز کر دیتے ہو کہ ع اب تو آرام سے گزرتی ہے آخرت کی خبر خدا جانے)

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے○ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے○

(جن لوگوں نے دنیا کی زندگی اس شان سے گزاری کہ "بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں" اور آخرت ہی کی زندگی ان کا ہدف و مقصود رہی' اس دن ان کے چہرے مسرت و شادمانی سے دمکتے ہوں گے اور وہ اپنے رب کی رحمتوں اور عنایات کے بجا طور رامیدوار ہوں گے)

اور کچھ چہرے اس دن بے رونق ہوں گے○ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہونے والا ہے○

(اور وہ بدبخت جو دنیا کے عیش و آرام اور لذت و راحت کی دلدل میں ایسے دھنسے کہ آخرت سے یکسر غافل ہو گئے بلکہ اگر کسی سبب سے ذہن اس جانب متوجہ ہوا بھی تو شعوری کوشش کے ذریعے آخرت کے خیال کو ذہن سے جھٹکتے رہے' اخروی زندگی جب ایک مجسم حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی تو اس کمر توڑ دینے والے عذاب کے خیال ہی سے ان کے رنگ اڑے ہوئے ہوں گے جس کے حق ہونے میں انہیں اس دن کوئی اشتباہ لاحق نہ ہو گا)

(سورۃ القیامہ' آیت نمبر ۱۶ تا ۲۵)

جوامع الکلم

یہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے

(جو اس حقیقت کو پا گیا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور یہاں کا ایک ایک لمحہ چوکس رہ کر گزارنا ہے مبادا کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جائے جو پروردگار کی ناراضگی کا باعث ہو' اس کے لئے یہ دنیا دار القرار نہیں ہو سکتی' اس کی نگاہیں ہمیشہ آخرت ہی پر مرکوز رہیں گی اور وہ دنیا میں خود کو اجنبی محسوس کرے گا' ہاں جن کا نقطہ نظر یہاں یہ رہا کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" ان کے لئے یہی دنیا سب کچھ ہے اور یہاں زیادہ سے زیادہ لذتوں کا حصول ہی ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہے گا)

(الحدیث)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۱۵

۹ / اپریل ۹۶ء

مدیر

حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات

تحریک خلافت پاکستان

۴ - اے، مزنگ روڈ، لاہور

○

مقام اشاعت

۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : ۵۸۶۹۵۰۱-۳

○

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ لاہور

○

قیمت فی پرچہ : ۸ روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

☆ ترکی، اومان، مصر ۱۳ / امریکی ڈالر

☆ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان ۲۰ امریکی ڈالر

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

رواں ہفتے کا سب سے گرم موضوع تو ججوں کی تقرری کے ضمن میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ اور اس پر حکمران پارٹی کا بوکھلاہٹ سے بھرپور ردعمل ہی ہے کہ جس کے باعث ملک کی سیاسی فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوا ہے۔ اس فیصلے سے پاکستان کی عدلیہ کے وقار کو بحال کرنے اور اس تاثر کو زائل کرنے میں یقیناً مدد ملے گی کہ پاکستان کی عدلیہ ہمیشہ حکومت وقت کی تابع مہمل رہی ہے۔ تاہم سپریم کورٹ کے اس اہم فیصلے سے ملک میں سیاسی اور عدالتی سطح پر ایک بحران کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس موضوع پر محترم جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری نے "حدیث امروز" میں بڑی عمدگی سے قلم اٹھایا ہے۔

زیر نظر شمارے کا ایک اہم مضمون مسلمانان ہند کی ملی پارلیمنٹ کے سرمائی اجلاس میں پیش کردہ سیاسی بل پر مشتمل ہے۔ ملی پارلیمنٹ کا یہ اجلاس ۱۴-۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو شری کرشن میموریل ہال پٹنہ میں منعقد ہوا۔ یہ بل انڈیا کے اندر بسنے والے مسلمانوں کی ایک نئی ابھرتی ہوئی سوچ کا آئینہ دار ہے۔ بھارتی مسلمانوں میں اب یہ شعور بیدار ہو رہا ہے کہ جس سیکولر جمہوری نظام کو وہ اپنے لئے اب تک ایک سہارا سمجھے بیٹھے تھے وہ ان کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہوا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ "گزشتہ پچاس سالہ سیاسی تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کے اندر مسلمانوں کی سیاسی ترقی تو کجا خود ان کی سیاسی بقا کا سوال مشکل ہے"۔ چنانچہ اب انکا مطالبہ ہے کہ "متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریق انتخاب کو عمل میں لایا جائے"۔ گویا اب بھارتی مسلمان اس رخ پر سوچنے لگے ہیں جس کی راہنمائی امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج سے چار پانچ سال قبل کی تھی۔ امیر تنظیم نے ہندوستان کے سفر کے دوران متعدد علماء کرام اور سیاسی زعماء سے ملاقات میں ان پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ دو قومی نظریہ جو مسلمانان ہند کی متفقہ آواز تھی اور جو تقسیم ہند کا سبب بنا تھا' اس کا لازمی منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے علیحدہ تشخص پر اصرار کرتے ہوئے اپنے لئے اقلیتی حقوق کا تقاضا کرتے اور سیکولرزم کی تائید کرنے اور مخلوط انتخابات کی دلدل میں دھنسنے کی بجائے جداگانہ طریق انتخاب کا مطالبہ کرتے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے دلائل سے واضح کیا تھا کہ مسلمانوں کا بھارت میں ہندو کے ساتھ ایک قوم شمار ہونا اور مخلوط انتخابات میں حصہ لینا ان کے لئے فائدے کا نہیں' مسلسل نقصان کا باعث رہا ہے۔ امیر تنظیم کی یہ بات بھارتی مسلمانوں کو اس وقت بہت ہی عجیب اور نامانوس محسوس ہوئی تھی اور بعض علماء اور سیاسی رہنماؤں نے اگرچہ امیر تنظیم کے دلائل کا وزن محسوس کرتے ہوئے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا تھا' لیکن اس وقت وہ کچھ زیادہ Convinced نظر نہیں آتے تھے۔ تاہم اب ملی پارلیمنٹ کے مذکورہ سیاسی بل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا ہے اور محترم ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ موقف کی اصابت ان پر منکشف ہوئی ہے۔

☆ ☆ ☆

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ پاکستان کے قیام میں بھارت کے مسلمانوں کا بھی بڑا حصہ تھا' لیکن قیام پاکستان کے بعد وہ مقصد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا جس مقصد کے لئے یہ ملک بنا تھا اور ساری صلاحیتیں اور توانائیاں محض دنیاوی مفادات حاصل کرنے میں صرف ہوئیں۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ایک طرف ہمارا وہ مراعات یافتہ طبقہ ہے جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے اور تمام ملکی وسائل اور ذرائع پر اس کا قبضہ ہے' دوسری طرف ملک کے عوام ہیں جو غربت پسماندگی اور افلاس کا شکار ہو کر آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس بھارت کے مسلمان عوام کا معاملہ ہے۔ انہوں نے بھی یہ عرصہ پسماندگی' غربت اور افلاس کا شکار رہتے ہوئے گزارا' مگر انہوں نے ہماری طرح پستی کی راہ اختیار نہیں کر لی بلکہ وہ عزم اور حوصلہ برقرار رکھتے ہوئے مسلسل اپنے حقوق کی بحالی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک مظہر عائلی قوانین کے معاملے میں کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے خلاف بھارتی مسلمانوں کے بھرپور اجتماع کے طور پر سامنے آیا تھا اور اب ملی پارلیمنٹ کا پیش کردہ مذکورہ سیاسی بل بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے۔ ویسے یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ بجائے اس کے کہ ہم مسلمانان مملکت خداداد پاکستان دنیا کے مسلمانوں' خصوصاً بھارت کے مسلمانوں کے لئے تقویت اور راہنمائی کا باعث بنتے' آج غیروں کے محتاج اور دست نگر نظر آتے ہیں!○○

دعا ہے کہ عمران خان جلد از جلد اس پھندے سے نکل آئیں

میں نے محترمہ جمائما عمران کے قبول اسلام پر ہرگز کبھی کوئی شبہ وارد نہیں کیا

"کسی کو غلط فہمی نہ رہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کسی منفی رویئے کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے"

۱۵ مارچ کے جنگ میں "ڈاکٹر صاحب اور جمائما عمران خان" کے زیر عنوان

شائع شدہ مجیب الرحمٰن شامی کا کالم جس میں امیر تنظیم اسلامی کا وضاحتی خط شائع کیا گیا

معروف صحافی مجیب الرحمٰن شامی نے اپنے ۱۰ مارچ کے اخباری کالم "جلسہ عام" کا آغاز جو "کرسی اور جیل" کے عنوان سے شائع ہوا' حمید نظامی مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسے پر تبصرے سے کیا تھا اور اختتام سعد رفیق صاحب کے ایک خط پر اپنے شدت جذبات کے اظہار پر۔ درمیان میں ایک چھوٹے سے پیرے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کو بھی بغیر کسی تمہید کے بایں الفاظ گھسیٹ لیا:

"کسی بھی شخص کی رائے حرف آخر نہیں ہے۔ کسی بھی شخص کی رائے کو الہامی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو دیکھئے جمعۃ المبارک کے روز مسجد کے منبر پر بیٹھ کر عمران خان کی اہلیہ جمائما کے قبول اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے اسلام کا ڈنکا بجا دیا ہے۔ گویا کسی غیر مسلم کو کلمہ پڑھنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینی چاہئے' وہ اللہ تعالیٰ کے "وائسرائے" ہیں' ہمارے جیسے لوگ اس پر مجبور ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی بات سنیں اور اس پر مسکرائیں کہ کسی کی زبان پکڑنا جمہوری عمل کا گلا گھونٹ دینا ہے"۔

اس پر امیر تنظیم اسلامی نے جو وضاحتی احتجاجی مراسلہ محترم شامی صاحب کو ارسال کیا' ہم شامی صاحب کے ممنون ہیں کہ اسے انہوں نے اپنے ۱۵ مارچ کے کالم میں من و عن شائع کر دیا۔ شامی صاحب کا مذکورہ کالم ذیل میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ تاہم اپنے اس کالم میں امیر محترم کے خط سے پہلے جو وضاحتی تمہید محترم شامی صاحب نے باندھی ہے اس میں جہاں امیر محترم کے لئے بہت نیک جذبات کا اظہار کیا ہے وہیں اس بات پر اظہار تاسف بھی کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو عمران کے بارے میں اس اخباری خبر کی ضرور تردید کر دینا چاہئے تھی جس کی رو سے محترم شامی صاحب کے بقول امیر تنظیم نے جمائما عمران خان کے اسلام پر شک کا اظہار کیا تھا اور یہی بات محترم شامی صاحب کے ۱۰ مارچ کے کالم کا سبب بنی تھی۔

ہمارے لئے یہ امر حیران کن ہے کہ جس اخباری خبر کے حوالے سے محترم شامی صاحب نے محترم ڈاکٹر صاحب پر اظہار تنقید کو ضروری خیال کیا اس میں بھی محترمہ جمائما عمران کے اسلام پر امیر محترم نے کہیں شک و شبے کا اظہار نہیں کیا' ان کے اسلام قبول کرنے پر نہ تو کوئی اعتراض وارد کیا اور نہ اسے سازش قرار دیا--- جبکہ شامی صاحب نے اسی ایک بات کو فرض کرتے ہوئے پہلے اپنے ۱۰ مارچ کے کالم میں تنقید و طنز کے تیر برسائے پھر محترم ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کے باوجود زیر نظر کالم میں بھی وہ اس پر مصر نظر آتے ہیں--- گویا جو بات سارے فسانے میں کہیں مذکور نہ تھی' وہی بات شامی صاحب کو ناگوار گزری۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے صرف یہ بات کہی تھی کہ "یہودیوں نے جمائما کے ذریعے عمران کو قابو کر لیا"۔ کوئی سادہ لوح مسلمان (مرد یا عورت) بھی تو نادانستہ طور پر یہود کا آلہ کار بن سکتا ہے اور تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے' لیکن اس کا لازمی مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایسے شخص کا اسلام بھی مشکوک سمجھا جائے!!! (ادارہ)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان کے نامور مفسر قرآن ہیں۔ اختلاف کے باوجود میں خود کو ان کا ادنیٰ نیاز مند سمجھتا ہوں۔ وہ ان چند رہنماؤں میں سے ہیں جن کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اپنے مافی الضمیر کو جھٹ زبان پر لے آتے ہیں اور کئی بار دیکھنے اور سننے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جلد بازی سے کام لے لیا ہے۔ ان کی زبان سے غیر ثقہ الفاظ بھی ادا ہو جاتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جذبات ان کے استدلال پر غالب آ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی قرآن اکیڈمی میرے گھر سے اگر بہت قریب نہیں تو بہت فاصلے پر بھی نہیں۔ کار سے چار منٹ میں وہاں پہنچا جا سکتا ہے۔ پیدل جائیں تو زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کا فاصلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود کو جس طرح قرآن کے لئے وقف کر رکھا ہے اور ان کی اولاد بھی جس لگن اور محنت سے ان کے راستے پر چل رہی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل رشک ہے۔ ایک عرصے تک صبح کی نماز باقاعدہ ان کی یا ان کے کسی نائب کی امامت میں ادا کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ اب بھی کبھار یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب دوسرے رہنماؤں اور سیاستدانوں کی طرح تضاد کا شکار نہیں ہیں۔ سادہ زندگی گزارتے ہیں اور ان کا اپنی ذات یا اپنے اہل و عیال پر خرچ ایک متوسط درجے کے پاکستانی سے کسی صورت زیادہ نہیں۔ شادی بیاہ پر اسراف کے خلاف بھی انہوں نے جہاد کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ ممتاز ہی نہیں ممتاز ترین ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں جس سادگی سے کیں' اس پر ہر وہ شخص خوش ہوا جو پاکستانی معاشرے کو فضول رسموں سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں اگر دوسرے دینی حضرات ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تعاون کریں تو ایک بڑا سماجی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے چند برس پہلے ماہ رمضان میں ترجمے اور تفسیر کے ساتھ دورۂ قرآن کا اہتمام کیا تھا۔ تراویح کے دوران وہ تلاوت شدہ آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتے جاتے۔ مطالعہ قرآن کا یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ اب یہ چلن عام ہو رہا ہے اور کئی حضرات نے اسے اپنا لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ کئی افراد اب ماہ رمضان کے دوران کئی مقامات پر اس مطالعے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنے لئے اور اپنے استاد گرامی کے لئے رحمتیں سمیٹتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب امریکہ جا کر دو رمضان گزار چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں بھی قرآن کی تفسیر مکمل کر لی۔ اس کے کیسٹ موجود ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساری تمہید اس لئے باندھی گئی ہے کہ جناب ڈاکٹر کو خود یا کسی قاری کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ ان کی شخصیت کے بارے میں کسی منفی رویئے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کئی سیاسی اور قومی معاملات پر ڈاکٹر صاحب اس طرح اظہار خیال کر گزرتے ہیں جس سے حسن ظن رکھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ لاہور کے ایک اردو اخبار کے صفحہ آخر پر ۹/ مارچ ۱۹۹۶ء کو ان کے خطبہ جمعہ کی ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس پر اظہار تاسف کرتے ہوئے چند فقرے لکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پر ایک خط ارسال کیا ہے' وہ ان کے اصرار کے مطابق من و عن چھاپا جا رہا ہے۔ پہلے ذرا وہ خبر پڑھ لیجئے جو تبصرے کا سبب بنی تھی۔

"ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہودی دولت اور عورت کے ذریعے عالم اسلام کے ابھرتے ہوئے افراد کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں' انکار کی صورت میں انہیں قتل کرا دیا جاتا ہے۔ عمران خان قومی ہیرو کے طور سامنے آ رہا تھا کہ یہودیوں نے جمائما کے ذریعے عمران کو اپنے قابو میں کر لیا"۔

اس خبر سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جمائما کے اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں اور اسے عمران خان کو قابو کرنے کا ایک "یہودی ہتھکنڈہ" یا "پھندا" قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جو اسلام کی روح اور اس کے دعوتی مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ کسی شخص کو اپنے اسلام کے لئے کسی سے سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی اللہ تعالیٰ کا "وائسرائے" ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ڈاکٹر صاحب ان الفاظ کی تردید کر دیتے یا ان پر تاسف کا اظہار کر دیتے۔ انہوں نے جو خط لکھا اس میں معاملے کی ایسی تفصیل بیان کی گئی ہے جس کا میری تحریر سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک کہ زبانی کلامی "کرم فرمائی" کا تعلق ہے' ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے' کبھی شاید کوئی بات مذاق میں ادا کر دی گئی ہو لیکن ڈاکٹر صاحب نہ میرا مسئلہ ہیں نہ موضوع۔ کہاں میرے جیسا ناچیز قلم کار' کہاں علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا ان جیسا پہاڑ۔

اپنے خط میں ڈاکٹر صاحب نے جمائما یا جیمیما کے نام کو موضوع بحث بنایا ہے' یہ ان محترمہ کا ذاتی معاملہ ہے اور اگر انہوں نے اپنا پرانا نام برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو انہیں اسلام ہی کی رو سے اس کا حق حاصل ہے۔ جہاں تک ان کے نام کی تبدیلی کے بارے میں اخباری رپورٹوں کا تعلق ہے ان کی صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مختلف اخبارات میں بے شمار قیاس آرائیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے لیڈی ڈیانا کی رونمائی کو چندہ جمع کرنے کا ذریعہ بنانے کو "مغربی اور صیہونی گرفت" کی مضبوطی قرار دیا ہے' جبکہ جو چندہ جمع کیا گیا ہے وہ پاکستان میں زیر علاج غریب مریضوں کے کام آئے گا۔ یہ لیڈی ڈیانا کو پیش نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ذریعے غریب پاکستانیوں کے لئے اکٹھا کیا گیا ہے۔ غریب پاکستانی مسلمانوں کی امداد کے اس اہتمام کو "مغربی اور صیہونی گرفت" کی مضبوطی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک عمران کے لئے اس دعا کا تعلق ہے کہ وہ جلد از جلد پھندے سے نکل آئیں تو اس میں ایک مثبت پہلو موجود ہے' اس لئے اس پر آمین کہا جا سکتا تھا بشرطیکہ عمران کسی یہودی یا عیسائی پھندے میں پھنسے ہوئے ہوتے۔ ان میں ایک "نو مسلم" کی سی سچائی اور دیانت پائی جاتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے اور اسے کسی بڑی بھلائی کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے بزرگوں اور دنیا کے خادموں کو عمران خان سے اسلام اور پاکستان کے لئے کام لینا چاہئے۔ جو خامی یا کوتاہی نظر آتی ہے' محبت اور حکمت سے اس کی نشاندہی کر کے اسے دور کرنے کا ذریعہ بنیں' ورنہ کہنے والے یہی کہیں گے۔

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی "حور" آئے گی ان کے لئے

اب ملاحظہ ہو ڈاکٹر صاحب محترم کا نامہ گرامی:

برادرم مجیب الرحمٰن شامی صاحب'
السلام علیکم!

آپ کی زبانی کلامی "کرم فرمائی" تو وقتاً فوقتاً ادھر ادھر سے سننے میں آتی رہتی ہے۔ لیکن اتوار ۱۰/ مارچ کے "جلسہ عام" میں آپ نے جو بقلم خود "ستم رانی" فرمائی ہے اس کے ضمن میں کچھ معروضات پیش کرنی ضروری ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح کسی کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی اسی طرح کسی کا قلم بھی نہیں روکا جا سکتا۔ تاہم غلط فہمی یا مغالطہ آمیزی کی تردید اور اصلاح ضروری ہے۔

میں نے محترمہ جمائما اہلیہ عمران خان کے قبول اسلام پر ہرگز کبھی کوئی شبہ وارد نہیں کیا۔ یہ سراسر بہتان ہے بلکہ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ جہاں تک عمران خان کے ساتھ نکاح کا تعلق ہے وہ اگر اسلام قبول نہ کرتیں تب بھی یہ فقہی اور شرعی طور پر پوری طرح جائز ہوتا۔ میں نے تمام تر اعتراض ان کے "اسلامی نام" یعنی "حائقہ" پر کیا تھا کہ اس کے لفظی معنی "گھیر لینے والی شے" کے ہیں جو نفسہ اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی' تاہم قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف عذاب الٰہی اور شامت اعمال کے ضمن میں استعمال ہوا ہے۔ بحمد اللہ بعد میں یہ نام تبدیل کر کے جمیلہ رکھ دیا گیا اور بات ختم ہو گئی۔ رہی یہ بات کہ بعد میں جمیلہ کو ترک کر کے دوبارہ "جمائما" ہی کیوں اختیار کیا گیا تو اس کا کوئی سبب میرے علم میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی وضاحت کی گئی ہو اور میرے علم میں نہ آئی ہو۔

عمران خان کے ضمن میں میرا اصل شبہ یہ تھا کہ جب وہ پاکستان کی نیم اسلامی اور نیم قبائلی روایات کے علمبردار بن کر ابھر رہے تھے اور ملت اسلامیہ پاکستان اور بالواسطہ خود اسلام کے لئے مفید خدمات سرانجام دے سکتے تھے انہیں "اغوا" کر لیا گیا ہے چنانچہ صرف مسلمانان پاکستان ہی نہیں' پوری دنیا کو توقع تھی کہ وہ ۔ "چہل سال عمر عزیزت گزشت۔ مزاج تو از حال طفلی نہ گشت" کے برعکس اب "کھیل کود" کو خیرباد کہہ کر شادی اپنے اعزہ و اقارب کی خواہش کے مطابق اپنے خاندان ہی میں' یا کم از کم کسی پاکستانی اور مشرقی طور و اطوار کی حامل لڑکی سے کریں گے۔ چنانچہ ہفت روزہ "ٹائم" کا جو مضمون ۲۷ / مارچ ۱۹۹۵ء کو فہرست مضامین میں درج ہونے کے باوجود شائع نہیں کیا گیا تھا تاہم بعد میں (بعینہٖ یا تبدیل شدہ صورت میں؟) ۱۷/ اپریل کو شائع کیا گیا اس میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ:

"KHAN HAS ANNOUNCED THAT HE WILL MARRY TARDITIONAL MUSLIM WOMAN"

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

انسانوں کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین صرف اسلام نے کیا ہے

اگر یہاں حقیقی اسلام نافذ ہوتا تو ہمارے دانش ور اس کے گن گا رہے ہوتے

مذہبی طبقے کے پاس دین کے غلبہ کے لئے جدوجہد نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں

تحریر : شمس العارفین

ہمارے ملک میں انگریزی اخبارات کو دو وجوہات کی بنا پر خصوصی اہمیت حاصل ہے اولاً یہ کہ ہمارا حکمران طبقہ ان کا مطالعہ کرتا ہے۔ ثالثاً ان میں لکھنے والوں کی اکثریت سنجیدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ حضرات وقتاً فوقتاً غیر ملکی زبان میں مختلف سیاسی' سماجی' ثقافتی' تاریخی اور دیگر اہم موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ماہ جنوری میں روزنامہ "ڈان" میں چند اہم مضامین شائع ہوئے جو ہمارے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ایک مضمون تو معروف ماہر آثار قدیمہ جناب پروفیسر اے ۔ ایچ ۔ دانی کے انٹرویو پر مشتمل ہے اور دوسرا جناب آفتاب قاضی صاحب کے زور قلم کا مرہون منت ہے۔ دونوں دانشور حضرات نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے قارئین کے افادہ کے لئے پہلے ان دونوں مضامین کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ بعد ازاں ہم اپنا تبصرہ نذر قارئین کریں گے۔

> "سوچنا پڑتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور دینی طبقے کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے کہ ایک کے نزدیک معاشرے میں اسلام کا اول تو کوئی رول ہی نہیں' سارا زور معاش' معاشرت اور تہذیب و تمدن پر ہے اور اگر کہیں ذکر آتا بھی ہے تو بہت ہی سطحی انداز میں' جبکہ اس کے برعکس دینی طبقے کے نزدیک اسلام کے بغیر ہمارا معاش' معاشرت وغیرہ کچھ بھی معتبر نہیں"

پہلے جناب پروفیسر اے ۔ ایچ ۔ دانی صاحب کے خیالات کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں جو کہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے "مطالعاتی مرکز برائے تہذیب وسطی ایشیا"

(Center for the study of Centeral Asican Civilization)

سے منسلک ہیں۔

"ابتداً" اسلام بحری راستے سے پاکستان پہنچا۔ مگر پاکستان کے اکثر علاقے اس وقت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جب وسطی ایشیا کے لوگ اپنے ساتھ اسلامی اقدار یہاں لائے۔ میں نے ایک دفعہ اندازہ لگایا تھا کہ پاکستان کی موجودہ آبادی کے ۶۲ فیصد حصے میں وسطی ایشیاء کا خون شامل ہے۔ اتنے قریبی تعلقات کا خاتمہ صرف ستر سال پہلے ہوا۔ اس سے پہلے لاہور' ملتان' پشاور اور شکار پور میں ایسے کاروباری حضرات موجود تھے جن کے تجارتی تعلقات وسطی ایشیاء کے ساتھ تھے۔

دیکھئے! خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جب بھی ہم اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں مسلم یا اسلامی نشاۃ ثانیہ کا خیال آتا ہے۔ ہم انسانیت کے اعتبار سے نہیں سوچتے۔ آپ مسلم ہوں یا غیر مسلم پہلے آپ ایک انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے آپ کی کچھ دنیاوی اور روحانی ضروریات ہیں جن کی تسکین ضروری ہے۔ چنانچہ جب ہم وسطی ایشیاء کے لوگوں سے تعلق قائم کرنے کی بات کرتے ہیں تو پہلا احساس یہی ہوتا ہے کہ انہیں ہم سے کیا چاہئے۔ اور ہم ان سے کون سی ضرورت پوری کر سکتے ہیں چنانچہ یہ مسئلہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کا نہیں بلکہ ایسی شے کے زندہ کرنے کا ہے۔ جس کے دروازے ستر سال سے بند ہیں یعنی وہ حقیقی تعلقات (جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے) ثقافتی' تاریخی' کاروباری' تجارتی' معاشی کے ساتھ ساتھ مذہبی ہیں گویا وہاں بہت سے مواقع میسر ہوں گے۔ یہ بھی ایک طرح کا احیاء اسلام ہے۔ کیونکہ ہم سب مسلمان ہیں نہ صرف مسلمان بلکہ ایسے سنی مسلمان جو صوفیانہ اسلام کے پیرو ہیں جو کہ عربوں سے مختلف ہے۔"

اب ہم جناب آفتاب قاضی صاحب کے خیالات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ان کا یہ مضمون ۵ جنوری اور ۱۲ جنوری کی دو اشاعتوں میں مکمل ہوا۔ ذیل میں صرف ان کے خیالات کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

"میرا یہ نظریہ (Thesis) کہ "پاکستان تاریخی اور کثیر الثقافتی سندھی خطہ" ہے۔ درج ذیل دلائل پر مشتمل ہے۔

(۱) جنوبی ایشیاء کی آج کی جغرافیائی سیاسی صورتحال کافی حد تک آٹھویں صدی عیسوی کی علاقائی سیاسی صورت حال کے مماثل ہے۔

(۲) پاکستان کے خطے میں چار (سندھی' پنجابی' بلوچی' پختون) نہیں صرف دو گروہ میں یعنی سندھی (پنجابی' سندھی' سرائیکی) اور فارسی (بلوچی' پشتو)

(۳) سندھی خطہ اٹک سے لے کر کراچی تک دریائے سندھ کے دونوں اطراف کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۰ء میں اس خطے کے لوگوں کے لئے پاکستان کی اصطلاح کو رواج دیا گیا۔

(۴) پنجاب کی اصطلاح جغرافیائی پہلو کو واضح کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح سندھی' سرائیکی' پنجابی علیحدہ زبانیں نہیں بلکہ بولیاں ہیں جن میں لہجوں کا فرق پایا جاتا ہے۔

(۵) بیسویں صدی میں نئے عالمی نظام کے رجحانات کے پیش نظر پاکستان کے قومی مفادات کو

اختلافی نظریاتی بنیادوں کی بجائے تاریخی حوالوں سے بہتر طور سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی تک سندھ اور ہند دو علیحدہ خطوں کی حیثیت سے قائم ہو چکے تھے۔ سندھی خطہ اٹک سے لے کر خلیج عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی حیثیت ہند اور وسطی ایشیاء کے درمیان ایک حفاظتی علاقے (بفرزون) کی سی تھی۔ ساتویں صدی میں اگرچہ طاقت کا توازن عربوں کے حق میں تبدیل ہو گیا مگر عربوں نے سندھ کی جغرافیائی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ سندھی خطے کی اصل مشکلات کا آغاز بارہویں صدی میں وسطی ایشیاء کے ایک فوجی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے پر ہوا۔ سندھ کے حفاظتی علاقہ (بفرزون) ہونے کی حیثیت کو اس زمانے میں سخت نقصان پہنچا ۱۵۲۰ء میں افغانوں اور مغلوں کے حملوں کے بعد اس کی حفاظتی علاقہ (بفرزون) کی حیثیت یکسر ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے سندھ اور مغربی پنجاب پر بتدریج ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۹ء میں قبضہ کیا۔ انیسویں صدی میں فوجی اور سیاسی توازن مکمل طور پر یورپ کے حق میں تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برصغیر میں دو آزاد ممالک انڈیا اور پاکستان وجود میں آ گئے۔ غالباً انگریزوں کو بھی یہ احساس نہیں ہوا ہو گا کہ جنوبی ایشیاء کی یہ سیاسی صورت حال روایتی جغرافیائی' سیاسی صورت حال سے مشابہ ہے' جنوبی ایشیائی ریاستوں (پاکستان' انڈیا) کے وجود میں آنے اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سندھی خطے کے بفرزون ہونے کا کردار ادا کرنے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بارہ سو سال میں پہلی مرتبہ برصغیر کے ممالک اس پوزیشن میں ہیں کہ وسطی ایشیا کی طرف سے مستقبل میں ہونے والے حملوں کے خلاف متحد ہونے کی ضرورت کا احساس کریں۔ پاکستان کا برصغیر اور وسطی ایشیاء کے درمیان حفاظتی علاقے (بفرزون) کا کردار ادا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ نظریاتی اور مذہبی ترجیحات پاکستان میں مقامی قوم پرست تحریکوں (Sub-Nationality Movements) کو بڑھنے سے نہیں روک سکیں۔ چنانچہ اب پاکستان کی مقتدرہ (Establistment) اور منتخب لیڈروں کو بدلتی دنیا کے حقائق کے مطابق قومی ترجیحات کی از سر نو تنظیم کرنی چاہئے"۔

ان دونوں حضرات کی آراء میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے اسلام کو ثانوی حیثیت سے پیش کرنا اور انسانی تاریخ اور روایات کو اولیت دینا۔ اگرچہ ہر شخص کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے لیکن سوچنا پڑتا ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور دینی طبقے کی سوچ میں اتنا فرق کیوں ہے کہ ایک کے نزدیک معاشرے میں اسلام کا اول تو کوئی رول ہی نہیں' سارا زور معاش' معاشرت' اور تہذیب و تمدن پر ہے اور اگر کہیں ذکر آتا بھی ہے تو بہت ہی سطحی انداز میں جبکہ اس کے برعکس دینی طبقے کے نزدیک اسلام کے بغیر ہمارا معاش' معاشرت وغیرہ کچھ بھی معتبر نہیں۔ نیز اس فاصلے کو کیونکر کم کیا جائے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے۔ اس کے دو ممکنہ جوابات ہیں اول یہ کہ چونکہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی نظام تعلیم کا پروردہ ہے لہٰذا بالکل غیر محسوس انداز میں مغرب کے معیارات ان مشرقی ذہنوں کا جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔ اور وہ ہر مسئلے کو انہیں کی آنکھوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔

دوسری وجہ جو اہم تر ہے وہ قیام پاکستان کے بعد ہماری پے در پے غلطیوں پر مبنی ہے۔ پاکستان کے قیام کو پچاس سال ہو چکے ہیں لیکن تحریک پاکستان کے مقاصد ہنوز تشنہ تکمیل ہیں۔ مستقبل قریب میں بھی ان کے روبہ عمل آنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر ہم نے قیام پاکستان کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ اپنے تعلیمی' معاشی اور سیاسی نظام میں کوئی پیش رفت کی ہوتی تو آج ہمارے دانشور تاریخ سے بعید از کار استدلال کرنے کی بجائے۔ نظام اسلام کے فوائد اور ثمرات کے گن گا رہے ہوتے۔ ہمارے حکمران نظریہ پاکستان سے مسلسل انحراف اور اسلام اور پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا باعث بنے رہے ہیں چنانچہ دانشور حضرات کا یہ کہنا بظاہر غلط نہیں کہ نظریاتی بنیادیں اور مذہبی عوامل ہمیں متحرک رکھنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے نظریہ پاکستان اور اسلام کی جانب سرے سے پیش رفت ہی نہیں ہوئی۔

اب ہم موضوع کے دوسرے نقطے کی طرف آتے ہیں کہ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ اس کا ایک آسان سا جواب تو یہ ہے کہ ہمارے حکمران نظریہ پاکستان سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے نفاذ اسلام کی طرف عملاً پیش قدمی کریں مگر ہماری اب تک کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ یہ کام کرنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا اس کے بعد دینی طبقات پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ اٹھیں اور اسلام کے غلبے کی جدوجہد کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچایا جائے۔ یہ قرآن ہی ہے جو انسانوں کے حقوق اور فرائض کا صحیح صحیح تعین کرتا ہے اور ایک صالح معاشرہ وجود میں لانے کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے' جو لوگ اس پیغام کو قبول کریں انہیں ایک قیادت میں منظم کیا جائے تاکہ ایک ایسی مضبوط طاقت وجود میں آئے جو میدان میں آ کر حکمران طبقے کو تحریک پاکستان اور اسلام کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور کر دے' عام لوگوں کے پاس تو پھر بھی کوئی نہ کوئی عذر ہو گا مگر دینی طبقے کے پاس یہ اہم فریضہ انجام نہ دینے کا کیا جواز ہے؟○○

☆☆☆☆

TO CHRISTIANS WITH LOVE

Based on the lectures delivered by

Dr. Israr Ahmad

Price Rs. 8.00

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore

سیکولر جمہوریت ایک دستوری فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں

ہندوؤں کی جانب سے جداگانہ طریق انتخاب کی مخالفت قیام پاکستان کا سبب بنی!

شریعت صرف مسلمانوں کی میراث نہیں ہے' یہ تو وسیع انسانی سماج کو چلانے کیلئے بہترین ضابطہ حیات ہے

انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام حیات کی پیروی کرنا دراصل کھلا شرک ہے

مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال رکھتے ہوئے ایک نئے عادلانہ غیر سودی نظام کی تشکیل ضروری ہے

شری کرشن میموریل ہال پٹنہ میں ملی پارلیمنٹ کے اجلاس منعقدہ ۱۴' ۱۵ جنوری ۱۹۹۴ء میں پیش کردہ مسلم سیاسی بل کا مسودہ جو بھارتی مسلمانوں میں ابھرتی ہوئی ایک نئی اور حقیقت پسندانہ سوچ کا بہترین آئینہ دار ہے!

پس منظر: ایک محتاط اندازے کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کوئی بیس کروڑ ہے جو مجموعی آبادی کا تقریباً بائیس اعشاریہ دو فیصد (۲۲ء۲) ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب تاریخی مذاق ہے کہ اتنی بڑی عددی قوت کو ایک بے بس اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا ملک کے معاملات میں عملی طور پر دخل صفر کے برابر ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے اس امت کو اپنا دست نگر بنا رکھا ہے۔ باور یہ کرایا گیا کہ اس ملک میں تم اقلیت میں ہو۔ تم نے پاکستان بنا کر اپنا حصہ پالیا ہے۔ اب بھلا تمہارا اس ملک میں کیا رول ہو سکتا ہے۔ بس یہی کہ خاموشی سے جئے جاؤ اور اس طرح جیو جس طرح ہم جینے دیں۔ برہمن مجموعی آبادی کے سات فیصد سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح اونچی ذات کی دوسری برادریوں کی علیحدہ رائے شماری انہیں قلیل اقلیت میں تبدیل کئے دیتی ہے۔ رہی نیچی ذات کی قومیں تو یہ بھی اپنی اپنی بنیادوں پر غیر مشروط اکثریت ثابت کرنے میں ناکام ہیں اگر دیکھا جائے تو آج بھی دوسری تمام قوموں کے مقابلے میں مسلمان ایک عظیم الشان عددی قوت ہیں۔

گزشتہ پچاس سالوں کے سیاسی تجربے کے بعد آج ہندوستانی مسلمانوں پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ موجودہ سیاسی نظام میں ان کے جائز سیاسی حقوق کا تحفظ ممکن نہیں۔ فی زمانہ ہر سیاسی پارٹی کا مکروہ مسلم دشمن چہرہ کھل کر سامنے آچکا ہے' ہر مشرک سیاسی قیادت کے ہاتھ مسلم خون سے رنگین ہیں' رہے خوش کن بیانات اور سبز باغ دکھانے کا سلسلہ تو اس کا انتظام تقریباً سبھی بڑی پارٹیوں نے کم و بیش کر رکھا ہے۔ کانگریس آئی اگر پانچ سو کروڑ روپیوں کی تھیلی دکھاتی ہے تو بی جے پی نے بھی اماموں کی تنخواہوں میں اضافے اور شیروانیوں کی تیاری کا کام شروع کر دیا ہے۔ رہی جنتا دل یا بائیں بازو کی قوتیں تو مسلمانوں کو مسحور کر دینے والی گرما گرم تقریروں کا یہاں بھی وافر انتظام ہے۔ اب ایک ایسی صورت حال میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جب ووٹ دینے سے سیاسی غلامی کے سائے مزید گہرے ہوتے جاتے ہیں اور جب کسی پارٹی کو ووٹ دینے سے مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا نہیں ہوتا تو آخر ووٹ دیا ہی کیوں جائے؟

تمہید:

ملک ٹوٹ پھوٹ کے دہانے پر پہنچ گا ہے۔ آج ہم میں سے بہتوں پر یہ بات منکشف ہو چکی ہے کہ ہم بہت تیزی کے ساتھ انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کی طرف گامزن ہیں۔ مابعد انہدام ہندوستان میں سیکولر جمہوری اقدار کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ اب اس ملک کے پاس کوئی ایسی نظریاتی اساس نہیں جو اس کی جغرافیائی سلامتی کی ضمانت دے سکے۔ رہے سیاسی قائدین تو یہ اتنے بدعنوان' خود پرست اور اقتدار کے بھوکے ہیں کہ انہیں وطن عزیز کے مستقبل کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ یہ محض اپنی غرض کے بندے ہیں۔ جن کا کام صرف اپنی سیاسی انا کی تسکین اور ہوا و ہوس کی تابعداری ہے۔ ایک ایسی سنگین صورت حال میں کوئی ملک خواہ اس کی کتنی ہی عظیم تاریخ کیوں نہ رہی ہو' اس کا شکست و ریخت کے عمل میں مبتلا ہو جانا فطری ہے۔ نہ صرف کشمیر' آسام' پنجاب اور ناگالینڈ بلکہ ہر چہار طرف سے احتجاج اور بغاوت کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ بعض علاقوں میں یہ احتجاجات نے سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے۔

اس ملک کے مجبور و مقہور باسیوں کے اندر یہ احساس عام ہے کہ ملک کا سیاسی نظام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایک مختصر سی برہمن اقلیت کو ہر طرح برتری حاصل ہو جائے اس برہمن اقلیت نے گزشتہ پچاس سالوں سے وسائل سے مالا مال اس ملک کو لوٹ کھسوٹ کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ لفظ ہندو کی من مانی دستوری تعریف نے برہمنوں کو اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کثیر لیکن مختلف الخیال قوموں کے نمائندہ اور رہنما کی حیثیت سے پیش کریں حالانکہ جن مختلف الخیال لوگوں کو ہندو بتایا گیا ہے نہ تو ان کے نظریات مشترک ہیں نہ ثقافت نہ رنگ و نسل اور نہ ہی بنیادی عقائد۔ البتہ گزشتہ

چند برسوں میں ان قوموں نے بھی جمے جمائے سیاسی ضابطوں اور کھیل کے تسلیم شدہ اصولوں پر تنقید شروع کر دی ہے۔ ان علاقوں میں جہاں ایک مختصر سی مدت کے لئے بھی کوئی غیر برہمنی حکومت قائم ہوئی وہاں سیاسی اور سماجی نظام کی ناہمواریاں کھل کر سامنے آئی ہیں جنہیں اگر بروقت سنجیدگی سے نہ لیا گیا تو یہ سب ایک ہمہ گیر اور مستقل نوعیت کی خانہ جنگی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ انتشار کی مختلف آوازوں اور فاشزم کے مسلسل اٹھتے ہوئے طوفان میں آخر اس ملک کو کون سی قوت یکجا رکھ سکتی ہے؟۔ یقیناً نہ تو کسی جابرانہ ریاستی اقتدار کے لئے ایسا ممکن ہے اور نہ ہی جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے نعروں کے ذریعہ یہ مہم سر کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم سوویت یونین کے تجربے سے سبق حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو ہمیں حقائق کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرنا ہو گا۔ ہمیں صورت حال کی فوری درستگی کی طرف توجہ دینی ہو گی اور پیش آمدہ تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی ہو گی۔ اس سرزمین کے ایک باشندے کی حیثیت سے ہمیں اب چوکنا ہو جانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ یہ جان لینے کے بعد کہ یہ ملک تیزی سے ایک خون آشام طوفان اور ہمہ گیر انارکی کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں لاکھوں زندگیاں تلف ہو جائیں گی۔ ضرورت ہے کہ اس ملک کے قافلے کا رخ فوری طور پر تبدیل کر دینے کے لئے ہمارے ہاتھ حرکت میں آ جائیں۔

ہم مسلمان اس ملک کے محض شہری ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہیں۔ خدا کے آخری رسول کی امت کی حیثیت سے اور آخری الٰہی پیغام کے حامل ہونے کے ناطے یہ ہماری بنیادی ذمہ داری ہے کہ ہم ہر قسم کے ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں خواہ یہ ظلم کسی کی طرف سے بھی ہو اور کسی کے خلاف بھی روا رکھا گیا ہو۔ یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم صورت حال کی اصلاح کے لئے آگے آئیں، نظام کفر کے چیلنج کو قبول کریں اور اس وطن عزیز کو جو انتظامی بدعنوانی اور غاصب حکمرانوں کی شیطانی آرزوؤں کے عذاب میں مبتلا ہے اسے ایک منصفانہ اور عادلانہ قیادت فراہم کریں۔

اسلام مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عملی دنیا میں کنارہ کشی کے رویئے پر گامزن رہیں یا کسی غیر اسلامی سیاسی نظریئے یا گروہ کی اتباع قبول کر لیں۔ یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ آخری رسول کی امت کو اس ملک میں یہ باور کرایا جاتا رہا ہے کہ ہندوستان میں وہ محض ایک اقلیت ہیں اور اس لئے ملکی معاملات میں کوئی بنیادی رول ادا نہیں کر سکتے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ بات انہیں مسلسل دوسروں نے نہیں بلکہ ان کے اپنے علماء اور دانشوروں نے باور کرائی ہے۔ ہمارے علماء ہمیں یہ بتاتے رہے ہیں کہ اس ملک میں نظام حکومت کے لئے سیکولر ڈیموکریسی سے بہتر کوئی نظام نہیں ہو سکتا اور یہ کہ ہمیں حالات کے تقاضے کے پیش نظر ایک الٰہی نظام کے تحت جینے کی تمنا اور اس سرزمین پر نظام عدل کے قیام کا خواب ترک کر دینا چاہئے۔ البتہ یہ کہتے وقت شاید وہ مسلم قائدین اس بات کو فراموش کر گئے کہ اسلامی نقطہ نظر سے انسان کے بنائے ہوئے کسی نظام حیات سے بیعت کرنا یا اس کی اتباع میں اپنے آپ کو دے دینا دراصل کھلا شرک ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اسلام کو اس ملک کے بین المللی معاشرے کے پیش نظر ایک ناقابل عمل نظریہ تصور کرتے ہیں وہ دراصل اپنے ایمان سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور اس طرح گویا کھلے ارتداد کا ارتکاب کرتے ہیں۔

"اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کو شخصی ارتقاء، تعلیم و تربیت اور بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے، نسل، رنگ یا جنس سے ہو"

البتہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کے انہدام نے امت مسلمہ پر بہت سے نئے حقائق منکشف کر دیئے۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ گزشتہ پچاس سالہ مسلم سیاسی تاریخ دراصل تاریک ایام تھے اور یہ کہ سیکولر جمہوری اقتدار میں یہ کس بل نہیں کہ وہ اسلامی علامتوں کے تحفظ کی ضمانت دے سکیں۔ مابعد انہدام ہندوستان میں مسلم کش فسادات کے نازک ایام میں مسلم قیادت کی نئی نسل نے جو ملی پارلیمنٹ کے قیام کے لئے جمع ہوئی تھی اس احساس کا شدت سے اظہار کیا کہ عملی طور پر سیکولر جمہوریت ایک دستوری فراڈ سے زیادہ کچھ نہیں۔ جس کا واحد مقصد بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی غلام بنائے رکھنا ہے۔

ملی پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے سیاسی امور جو بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک منصفانہ سیاسی متبادل کی تلاش کے لئے قائم کی گئی تھی۔ طویل غور و فکر، صلاح و مشورے اور قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ موجودہ الیکشنی نظام میں مسلمانوں کا سرے سے کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ بعض بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ اگر کھیل کے غیر منصفانہ اصول نے ہمارے لئے فتح کے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں تو نئے سرے سے اصول ترتیب دیئے جائیں اور اگر کوئی مخصوص سیاسی نظام سیاسی انصاف کی ضمانت دینے میں بری طرح ناکام رہا ہے تو ایک نئے سیاسی نظام کی ترتیب و تشکیل کے لئے منصوبے بنائے جائیں۔

بہت کچھ غور و فکر کے بعد آج ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں سیاسی انصاف کے قیام کے لئے جلد از جلد سیاسی نظام کو بدل ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اب اس ملک میں بیس کروڑ کی عظیم عددی قوت کو اقلیت باور کرایا جانا مزید ممکن نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں شاید کوئی دوسری مثال نہ مل سکے جب اتنی بڑی عددی قوت کو نصف صدی تک مسلسل اقلیت باور کرایا جاتا رہا ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل دیا گیا ہو جس میں سماجی انصاف، سیاسی آزادی، انسانی حقوق اور جمہوری اقتدار کے خوشنما نعروں کے جلو میں دراصل اکثریت کا قاہرانہ تسلط قائم کر دیا گیا ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل آج اس مروجہ سیاسی نظام کو یکسر کالعدم قرار دیتی ہے اور سیاسی انصاف کے رہنما اصولوں کی روشنی میں اس ملک کے باسیوں کو دعوت عام دیتی ہے کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کا ایک خاکہ تیار کریں۔ ایک ایسے نظام کی تشکیل کی کوشش کریں جس میں ہر شخص، عقیدے، مذہبی گروہ اور نظریاتی جماعتوں کو زندگی گزارنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اور اس راہ میں پہلے مرحلے کے طور پر متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لاتے ہوئے ایک منصفانہ سیاسی نظام کے قیام کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ جداگانہ انتخاب کوئی ایسی خطرناک اصطلاح نہیں ہے جس سے ہم خوف کھائیں یہ کوئی نئی سیاسی بدعت نہیں ہے۔ ماضی میں بھی اس طریقہ انتخاب کا استعمال مختلف معاشروں میں عام رہا ہے۔ قبرص بوسنیا اور ماقبل تقسیم ہندوستان اس قبیل کی بہترین مثالیں ہیں۔ جہاں مذہبی یا نسلی گروہ اپنے اپنے نمائندوں کا

انتخاب کرنے کا حق رکھتے تھے۔ یہ خوف بھی بے جا ہے کہ جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لانے سے نئے پاکستان بننے کے راستے کھلیں گے۔ پاکستان کا بننا جداگانہ طریقہ انتخاب کو تسلیم کئے جانے کی وجہ سے ممکن نہیں ہوا بلکہ اس طریقہ انتخاب کی مخالفت کرنے والی قوتوں نے دراصل قیام پاکستان کے لئے جواز فراہم کیا۔ آج بھی ملک کو یکجا رکھنے کے لئے سیاسی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا لازم ہوگا۔ لہٰذا اس ملک کو ایک پرامن معاشرے میں تبدیل کرنے اور علیحدگی پسندوں کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے لازم ہوگا کہ متناسب نمائندگی کے فارمولے کو فوری طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ سماجی انصاف کے دوسرے مرحلے میں عظیم ہندوستان کو مختلف ثقافتی گہوارے کے وفاق میں تبدیل کردیئے جانے کا منصوبہ ہے۔

ملک کی موجودہ سنگین صورت حال سیاسی عدم توازن سماجی انتشار اور اس کے ٹوٹ جانے کے شدید خطرات کے پیش نظر تاریخ کی قوت آج ہمیں اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ اس ملک کو شکست و ریخت کے عمل سے بچانے کے لئے منصفانہ سیاسی فارمولوں کی وکالت کریں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لئے بعض بنیادی نوعیت کے سیاسی فیصلے لینے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سیاسی بل دراصل اسی سمت ایک قدم ہے۔

اول : دستوری ترامیم :

(۱) اسلام کی رو سے مومن کی پوری زندگی خواہ وہ نجی ہو یا سماجی قرآن کے تابع ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے علاوہ کسی اور نظام کا اتباع مومن کے لئے کفر کے مترادف ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو اس ملک کا نظریاتی شہری بنانے کے لئے دستور میں ان ضروری شقوں کا اضافہ کیا جائے جو مسلمانوں کے لئے مکمل اسلامی زندگی کی ضمانت دے سکے۔

(۲) مسلمان کے لئے اسلام محض ایک نجی معاملہ نہیں ہے اس لئے مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی پر اسلامی نظام کی عملداری قائم کرے۔ موجودہ نظام حیات میں عملی طور پر ایسا مشکل ہو گیا ہے۔ دستور اس ملک کے کارداں کو یونیفارم سول کوڈ کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن کا مطالبہ ہے کہ مسلمان قرآنی سول کوڈ کی طرف معاشرے کے کارداں کو گامزن کردیں۔ ہندوستانی دستور اور الٰہی احکامات میں اس واضح ٹکراؤ کو دور کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کے وسیع مفہوم کا احساس پیدا ہو۔ اور دستور ہند کے اسلامی احکامات سے متصادم ہونے کا خیال ختم ہو۔

(۳) خدا کی نازل کردہ شریعت صرف مسلمانوں کی میراث نہیں ہے بلکہ وسیع انسانی سماج کو چلانے کے لئے بہترین ہدایت ہے۔ اس لئے انسانی معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے انسانوں کے خود ساختہ قوانین' تعزیراتی حدود اور نیک و بد کے پیمانے کو حتمی قرار دینے کے بجائے الٰہی قوانین کو رہنما اصولوں کے طور تسلیم کرلیا جائے۔ ملک میں جاری سیاسی نظام کا یکسر خاتمہ کیا جائے اور اس کی جگہ سماجی انصاف کے لئے رہنما قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک نئے نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی جائے۔

> **"مسلمان کے لئے اسلام محض ایک نجی معاملہ نہیں ہے اس لئے مومن پر لازم ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی پر اسلامی نظام کی عملداری قائم کرے۔ موجودہ نظام حیات میں عملی طور پر ایسا مشکل ہو گیا ہے"**

(۴) یہ بات تسلیم کی جائے کہ ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت' گورا ہو یا کالا' امیر ہو یا غریب' نیچی ذات کا ہو یا اونچی ذات کا ہر کوئی اللہ کی مخلوق ہے۔ لہٰذا ایک ایسا سیاسی نظام واضع کیا جائے جس میں کسی کو کسی پر سبقت حاصل نہ ہو۔ سوائے ان کے جو لوگ اللہ سے نسبتاً زیادہ ڈرنے والے ہوں۔

دوم : سیاسی نظام کی اصلاح :

(۱) گزشتہ پچاس سالہ سیاسی تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کے اندر مسلمانوں کی سیاسی ترقی تو کجا خود ان کی سیاسی بقا کا سوال مشکل ہے۔ مروجہ انتخابی طریقہ کار نے اس ملک میں بعض ایسی اسمبلیوں کو جنم دیا ہے جن میں نام کو بھی کوئی مسلمان ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ الیکشن کے مروجہ طریقے کو یکسر تبدیل کردیا جائے۔

(۲) سماجی انصاف کے قیام کے لئے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقہ انتخاب کو عمل میں لایا جائے تاکہ اس ملک میں بسنے والی ہر لسانی مذہبی اور نظریاتی اکائی ملک کی ترقی کے منصوبوں میں یکساں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لے سکے۔

(۳) گزشتہ چند برسوں میں بعض مذہبی اکائیوں میں یہ احساس بڑی شدت اختیار کرتا گیا ہے کہ ملک کے موجودہ سیاسی نظام میں ان کی فلاح و بہبود کا امکان معدوم ہے اور یہ کہ اقلیتیں اس جمہوری نظام میں اکثریت کے قہر کے نیچے پس کر رہ گئی ہیں اس احساس نے ملک کے مختلف حصوں میں علیحدگی پسندی کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ جداگانہ طریقہ انتخاب علیحدگی پسندی کی تحریکوں کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے موثر نسخہ ثابت ہوگا۔

(۴) مختلف نظریاتی' تہذیبی اور مذہبی قومیتوں کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنے کے لئے مرکزی سطح پر ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جس میں متعلقہ قومیتوں کے نمائندہ افراد کو شامل کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ملک گیر سطح پر غیر جانبدارانہ مردم شماری کا ایک ایسا ہمہ گیر منصوبہ بنایا جائے جس کی توثیق ہندوستانی مسلمانوں کی ملی پارلیمنٹ نے کردی ہو۔

(۵) مردم شماری کے عمل میں مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کے لئے مرکزی' صوبائی' ضلعی اور بلاک کی سطح تک ان خصوصی مسلم اہل کاروں کا تقرر کیا جائے جو امت کے نزدیک قابل اعتبار ہوں۔

(۶) لوک سبھا میں متناسب نمائندگی کے فارمولے کو عمل میں لاتے ہوئے ۱۱۹ نشستوں پر ملک گیر سطح پر مسلم رائے شماری کرائی جائے اور پھر زیادہ ووٹ پانے والے امیدواروں کو منتخب قرار دیا جائے۔

(۷) ہندوستان جیسے وسیع ملک کا سیاسی نظام چلانے کے لئے مناسب ہوگا کہ اسے چھوٹے چھوٹے وفاق میں تقسیم کردیا جائے۔ اس طرح پورے ملک پر یوپی اور بہار کے سیاسی تسلط کا احساس بھی کم ہوگا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے صوبے اپنی ترقی کی رفتار کو زیادہ منظم انداز سے جاری رکھ سکیں گے۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کی بے پناہ ترقی اور سوویت یونین جیسے وسیع و عریض خطے کے معاشی دیوالیہ پن سے سبق لیا جانا چاہئے۔

(۸) سیاسی' مذہبی' جغرافیائی' تہذیبی اور لسانی بنیادوں پر ہندوستان کو وفاقوں کے اجتماع میں بدلنے کے لئے ۱۲۲ چھوٹے چھوٹے خود مختار وفاق میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ سارے وفاق خود مختار ہوں۔ البتہ ان کی خارجہ پالیسی اور دفاع کا کام مرکز کے زیر نگرانی ہو۔

(۹) ان مختلف وفاق کو تاریخی' تہذیبی اور مذہبی

آبادی کے اجتماع کی بنیاد پر مخصوص تہذیبوں کا گہوارہ قرار دیا جائے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ہندوستان کی کوئی تہذیب ریاستی سرپرستی سے محروم نہ رہ گئی ہو۔

(۱۰) ان تمام تہذیبی وفاق کو کلی طور پر غیر عسکری زون قرار دیا جائے تاکہ عسکری سرگرمیوں کے لئے ان حکومتوں کو کوئی گنجائش حاصل نہ رہے اور وفاق کے باہمی نزاع میں قوت کے استعمال کا دور دور تک کوئی امکان نہ پایا جائے۔

(۱۱) ان وفاق میں پائی جانے والی اقلیتوں یا کسی خاص ریاست کی معاشی خوشحالی کے پیش نظر دوسری ریاستوں سے آکر آباد ہونے والی تہذیبی اقلیات کو پھلنے پھولنے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے۔ البتہ وہ اگر اپنی تہذیبی ضرورتوں کے پیش نظر متعلقہ تہذیبی ریاست کی طرف دیکھتی ہوں تو اسے دستوری طور پر معتبر سمجھا جائے اور اس بارے میں ان کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ کسی ایک مقامی ریاست کے شہری نہیں بلکہ وسیع تر ہندوستانی وفاق کے شہری ہیں۔

> "سوویت یونین کے تجربے سے سبق حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو ہمیں حقائق کا کھلی آنکھوں سے سامنا کرنا ہوگا۔ ہمیں صورت حال کی فوری درستگی کی طرف توجہ دینی ہوگی اور پیش آمدہ تباہ ناکیوں سے بچنے کے لئے سخت جدوجہد کرنی ہوگی"

سوم : ثقافتی اصلاحات :

(۱) اس حقیقت کے پیش نظر کہ ثقافتی اظہار کو تاریخ اور مذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا یہ کہنا کہ کوئی معاشرہ اپنے ثقافتی اظہار میں خالصتاً سیکولر ہو سکتا ہے ایک لغو خیال ہے۔ گویا ہندوستانی سیکولرزم کو ایک نئی تعبیر کی ضرورت ہے اور اگر اس تعبیر کو Pluralism کے وسیع مفہوم میں لیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گزشتہ پچاس سالوں میں سیکولرزم کے نام پر اکثریتی فرقہ کی ثقافت کو فروغ دیا جاتا رہا ہے۔ سرکاری تقریبات میں ہندو وانہ رسم و رواج کی پاسداری نے مسلمانوں کے اندر ایک شدید احساس محرومی کو جنم دیا ہے۔ جس کے ازالے کے لئے لازم ہے کہ مسلم ثقافتوں کے اظہار کے لئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں سرکاری سطح پر اس کا نظم کیا جائے۔ گویا یہ مسلم تہذیبی وفاق سے وجود میں آنے سے قبل کی ایک عبوری شکل ہوگی۔

(۲) روز مرہ کی زندگی سے ہندو ثقافت کے اظہار کی موجودہ شکلوں کو ختم کرنا نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ہی یہ مسئلے کا حل ہے لہٰذا تہذیبی اظہار کے طریقے کی اصلاح کے بجائے اس بات پر زور دیا جائے کہ مسلم ثقافتی اظہار کے لئے بھی یکساں اور موثر مواقع فراہم ہو سکیں۔

(۳) ہندوستانی وفاق کو ایک لسانی رابطے میں مربوط رکھنے کے لئے ہندی اور اردو کے جھگڑوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک ایسی زبان تشکیل دی جائے جو ہندی اور اردو کے ذخیرہ الفاظ کی بنیاد پر رومن رسم الخط میں لکھی جائے تاکہ کسی ایک مذہبی اکائی کو کسی دوسری پر سبقت پانے کا احساس نہ ہو۔ البتہ متعلقہ تہذیبی ریاستوں میں اپنی پسند کے رسم الخط یا اپنی پسند کی زبان کو سرکاری سرپرستی عطا کرنے کا پورا موقع رہے۔

(۴) وفاقی حکومت مختلف ریاستوں کے یا ان ریاستوں میں پائی جانے والی یا اپنی مرضی سے آکر آباد ہونے والی اقلیات کی ثقافتی ضروریات کے لئے خصوصی طور پر مرکز میں ادارے قائم کرے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ وفاقی فنڈ سے کسی مخصوص ثقافت یا تہذیب کی سرپرستی کا کام انجام نہ پائے۔

چہارم : ضروری اقدامات :

(۱) مجوزہ وفاق میں حکومتیں اس بات کو یقینی بنائیں کہ انسانی جان کی حفاظت ان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ کسی بے گناہ کا خون بہنے سے روکا جائے۔ وفاقی حکومت کو یہ حق حاصل ہو کہ کسی شہری کے ناحق خون پر وفاق کا ہنگامی اجلاس طلب کر سکے۔ ریاستوں کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی حدود میں ناحق مرنے والوں کے جرم کی تلافی کے لئے تین دن کے اندر ورثاء کو ایک خطیر رقم عطا کریں۔ تاخیر کی صورت میں مجوزہ رقم سے کئی گنا زیادہ ادا کرنے کو یقینی بنایا جائے۔

(۲) افراد ہی نہیں بلکہ ریاستوں سے بھی ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت سلب کر لی جائے۔ دہشت گردی خواہ ریاستی ہو یا فرد واحد کی طرف سے اسے یکساں قابل مذمت سمجھا جائے اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں دور دور تک ہتھیار دکھائی نہ دیں۔

(۳) انسانی آزادی کے تحفظ کے لئے ہر ممکن پروگرام ضرور وضع کیا جائے۔ البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ریاستیں اس کا بہانہ بنا کر اظہار خیال کی آزادی اور نظریے کی تبلیغ پر کوئی پابندی عائد نہ کر سکیں۔

پنجم : مذہبی آزادی کا مسئلہ :

(۱) اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلام کا تصور دین دوسرے ادیان کے تصور مذہب سے قطعاً مختلف ہے اور یہ کہ اسلام زندگی کے ہر گوشے میں اپنے ماننے والوں سے واضح مطالبات رکھتا ہے۔ دستور میں دی گئی مذہبی آزادی امت مسلمہ کے لئے ہمیشہ ناکافی محسوس ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً اس ملک میں مسلمان شریعت کے تحفظ کی مہم چلاتے رہے ہیں۔ لازم ہے کہ مذہبی آزادی کے واضح اسلامی تصور کو دستور سے ہم آہنگ کیا جائے۔

(۲) گزشتہ پچاس سالوں کے دوران امت مسلمہ کو شدت سے اس بات کا احساس رہا ہے کہ مذہبی آزادی کے وعدے ان کے مذہبی عزائم کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور اس بارے میں دستور کی دفعہ ۴۴ کو بھی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سمت دستور کی ان تمام شقوں میں تبدیلیاں لائی جائیں جو کسی بھی درجے میں امت مسلمہ کی مذہبی آزادی پر روک لگاتی ہوں۔

(۳) اس حقیقت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی مکاتب اور مدارس میں تعلیم پاتی ہے اور یہ کہ اسلامی علوم کا حصول مسلمانوں پر عائد کردہ ایک مذہبی ذمہ داری ہے' وفاقی حکومت کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو اس مذہبی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرے۔ اور آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلم تعلیمی اداروں کے لئے تعلیم کے مرکزی بجٹ سے حصہ مختص کرے۔ اور اس کے نفاذ کا کام فی الحال مسلم انجمنوں اور مستقبل میں نئے ہندوستان کی مسلم ریاستوں کو سونپ دیا جائے۔

(۴) پچاس سالہ سیکولر تجربے کی روشنی میں اب اس بات کے واضح ہو جانے پر کہ ثقافتی طریقہ اظہار کو

مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ ہر مذہبی گروہ کو اس ملک میں اپنے اپنے انداز سے زندگی گزارنے کی مکمل ضمانت دینے کے لئے ضروری ہے کہ مرکز میں مختلف مذاہب' نظریاتی گروہ کے لئے الگ الگ سیل قائم کئے جائیں جو وزارت مذہبی امور کے تحت اپنے فرائض انجام دیں۔ البتہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ہر مذہبی گروہ اپنی علیحدہ شناخت کے قیام کے لئے کوئی متفقہ تحریری منشور ضرور پیش کرے۔ خواہ یہ مذہبی کتابوں کی شکل میں ہوں یا انجمنوں' اداروں اور نظریات کی بنیاد پر وجود میں آنے والے مذہبی گروہ کی شکل میں۔ نیز اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ کسی مذہبی گروہ پر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لیبل نہ تھوپا جا سکے۔

(۵) شرعی عدالتوں کے تصور کو مذہبی آزادی کا ایک حصہ قرار دیا جائے اور اس سلسلے میں ان کی ترتیب و تشکیل کے مسئلے کو کلی طور پر مستقبل کی مسلم ریاستوں پر چھوڑ دیا جائے تاکہ ہر مسلم ریاست اپنی ضرورت کے مطابق اسے مختلف شکل دے سکے۔

ششم : تعلیمی نظام کی اصلاح :

(۱) اس حقیقت کے تسلیم کئے جانے کے بعد کہ خالصتاً سیکولر نظام تعلیم کا تصور عملی طور پر ممکن نہیں اور یہ کہ گزشتہ پچاس سالوں سے سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں اور کالجوں میں سیکولرزم کے نام پر اکثریتی فرقے کے مذہبی عقائد' قصہ کہانیاں اور اوہام کی ترویج و اشاعت ہوتی رہی ہے۔ ایک ایسا نظام تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں پائے جانے والے ہر مذہبی فرقے اور نظریاتی گروہ کے بنیادی عقائد اور تصورات سے طلباء کو واقف کراتا ہو۔ ملک میں پائی جانے والی باہمی نفرت کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے لازم ہوگا کہ ہماری درسی کتابیں سبھی مذاہب کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرتی ہوں۔

(۲) اس امر کے پیش نظر کہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات دوسری مذہبی اکائیوں سے مختلف ہیں اور یہ کہ علوم اسلامی کے ادارے اور عربی مدارس کے موجودہ نظام مسلم تعلیمی نظام سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے' مرکز اس بات کو یقینی بنائے کہ جب تک مستقبل کی مسلم ریاستیں وجود میں نہیں آتیں تب تک عارضی طور پر مسلم نظام تعلیم کے ارتقاء کو یقینی بنایا جائے۔

(۳) وفاق کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد میں تاریخی اعتبار سے معروف مسلم تعلیمی اداروں اور دانش گاہوں کو مسلم تعلیمی ورثہ کے طور پر تسلیم کیا جائے اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری وفاقی حکومت پر ہو۔

(۴) گو کہ ہر ریاست کو اس بات کی قطعی آزادی ہو کہ وہ اپنی پسند کا تعلیمی نظام ترتیب دے۔ البتہ اسے کسی مذہب یا نظریاتی گروہ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈوں سے اپنی درسی کتابیں بھرنے کا حق حاصل نہ ہو۔ مرکزی حکومت وفاق کے تعاون سے اس امر کو یقینی بنائے۔

ہفتم : لسانی مسئلہ :

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک ملک کی ساری زبانیں یکساں معتبر ہیں اور عقیدے کی رو سے کسی بھی زبان میں اظہار خیال سے انہیں کوئی الجھن نہیں۔ البتہ وہ کسی بھی زبان کے جابرانہ تسلط کے خلاف ہیں۔ مستقبل کے ہندوستان میں جہاں ریاستوں کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے اپنے ریاستی حدود میں کسی خاص زبان یا رسم الخط کو اختیار کر سکیں وہیں مرکز پر یہ لازم ہوگا کہ وہ بین الوفاقی ٹیلی ویژن نٹ ورک پر مختلف زبانوں کو مناسب نمائندگی دینے کی پالیسی پر پابندی سے عمل پیرا رہے۔

(۲) مستقبل کے ہندوستان میں ہر شخص کو اس بات کی ضمانت حاصل ہوگی کہ وہ اپنی مادری زبان میں ابتدائی مراحل کی تعلیم حاصل کر سکے۔ اگر کسی وجہ سے وفاقی ریاستیں اپنی حدود میں مذکورہ زبان میں تعلیم کا نظم نہ کر سکیں تو ان پر لازم ہوگا کہ ان طلباء کو ریاستی وظائف پر متعلقہ زبانوں والی ریاستوں میں تعلیم کے لئے بھیجیں۔

(۳) گو کہ وفاق کی سرکاری زبان رومن رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی ہوگی البتہ ریاستوں کی سرکاری زبان بھی مرکز کے نزدیک تسلیم شدہ ہوگی اور ان زبانوں کے لئے وفاقی حکومت کے زیر تحت ایک بورڈ قائم ہوگا۔

ہشتم : معاشی مسئلہ :

(۱) اس امر کے پیش نظر کہ ملک کے موجودہ معاشی نظام میں مسلمانوں کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے اور ملک کی بڑی صنعتوں پر مخصوص ذاتوں کی اجارہ داری ہے۔ مستقبل کے ہندوستان میں نوزائیدہ ریاستوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ معاشی انصاف کے قیام کے لئے موثر اصول وضع کریں اور سماجی انصاف کے ضابطوں کے تحت مرکز بھی ان بنیادی اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنائے۔

(۲) مسلمانوں کی بیشتر صنعتیں موجودہ جابرانہ معاشی نظام میں یرغمال بنالی گئی ہیں جن سے اصل فائدہ سیاسی اقتدار میں شرکت دار غیر مسلم قومیں اٹھا رہی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ روایتی مسلم صنعت و حرفت میں بھی مسلمان محض کاریگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ نئے ہندوستان میں وفاق کی ریاستیں اپنے اپنے علاقوں میں اس معاشی استحصال پر روک لگائیں۔ ملک کے وسائل کا چند ہاتھوں میں اجتماع ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے یقینی بنایا جائے۔

(۳) ملک کے موجودہ معاشی نظام میں مسلمانوں کی انتہائی قلیل شرکت کی اہم وجوہات میں سے ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ پورا معاشی نظام' کاروباری ترقی کے مواقع' لین دین کا معاملہ' قرضوں کے حصول اور واپسی کا طریقہ' ریاستی سرپرستی یا سہولتوں کی اسکیم یہ سب کچھ سودی نظام پر قائم ہے۔ جس میں شرکت کے لئے مسلمان نظریاتی طور پر خود کو فٹ نہیں محسوس کرتا۔ اس لئے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کا خیال رکھتے ہوئے ایک نئے عادلانہ غیر سودی نظام کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کو بھی اس ملک میں یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔

(۴) نئے ہندوستان میں وفاق کی مسلم ریاستیں غیر سودی عادلانہ معاشی نظام کی ترتیب و تشکیل میں اہم کردار ادا کریں گی۔ البتہ مرکز پر بھی یہ لازم ہوگا کہ وہ ایک متبادل غیر سودی معاشی نظام کی تشکیل کے عمل میں اپنے شہریوں کی نظریاتی ضرورت کے تحت ایک موثر اور فعال کردار ادا کرے۔

(۵) البتہ وفاق کے وجود میں آنے سے قبل کے عبوری مرحلے میں ملک بھر میں ایک متبادل غیر سودی بینکنگ کے نظام کے قیام کے لئے ریزرو بینک آف انڈیا وہ تمام سہولتیں فراہم کرے جو کسی عام بنکاری کے ادارے کے قیام کے لئے حاصل ہیں۔ بالفاظ دیگر ایک غیر سودی بنکاری کے نظام کو عبوری مرحلے کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔

(۶) اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ اس ملک میں رہنے والے ہر شخص کو شخصی ارتقاء' تعلیم و تربیت اور بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے' نسل' رنگ یا جنس سے ہو۔OO

موجودہ نظام میں شریعت کے نفاذ سے اصل فائدہ حرام خوروں کو حاصل ہو گا

اسلام جرائم کے ذرائع اور اسباب کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے

تحریر: محمد سمیع، کراچی

عوام کی مشکل یہ ہے کہ وہ دہشت گردوں اور پولیس دونوں کے ظلم کا شکار ہیں

ڈی آئی جی کراچی ڈاکٹر شعیب سڈل صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا ہے کہ انکوائری آپ سینکڑوں کروا لیں لیکن یہ کامیاب اس صورت میں ہوتی ہے جب عوام بھی سامنے آئیں اور مدد کریں۔ انکوائری افسر کے سامنے ٹھوس شواہد رکھیں۔ ہمارا پورا عدالتی نظام گواہی کی بنیاد پر چلتا ہے۔ اس لئے آپ کو عدالت میں ہر چیز ثابت کرنی پڑتی ہے۔ پولیس والے جب تفتیش کرتے ہیں تو کسی کو مجرم نہیں بلکہ ملزم کہتے ہیں کیونکہ الزام ہمیں عدالت میں ثابت کرنا ہوتا ہے۔ زیر حراست ملزم کو ہلاک کرنے کا الزام لگانا نہایت آسان ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ اسے انکوائری افسر کے سامنے ثابت کریں۔ اس سے قبل ہمارے وزیر داخلہ صاحب فرما چکے ہیں کہ ہمارے عدالتی نظام میں سقم موجود ہے۔ گواہوں کی عدم دستیابی کی بناء پر دہشت گرد بری ہو جاتے ہیں۔ دونوں حضرات اس شعبے سے متعلق ہیں جس کا کام لوگوں کو عدل فراہم کرنا ہے۔ دونوں کے بیانات سے ان کی بے بسی کا اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ہی موجودہ نظام عدل پر عدم اعتماد کا اظہار بھی۔ اس کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اس نظام سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے تیار نہیں۔ عوام جو اس نظام کی چکی میں پس رہے ہیں اگر دہشت گردوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں تو دہشت گردوں کے خلاف گواہی دینے والا کوئی نہیں ہوتا اور اگر پولیس کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں تو پولیس کے خلاف گواہی دینے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ دونوں صورتوں میں عام لوگ ظلم کا شکار ہیں لیکن جب انتخابات کا موقع آتا ہے تو یہی لوگ ایسے افراد کو منتخب کرتے ہیں جو اس نظام کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دہشت گردوں کے ٹارچر سیلوں میں ان پر تشدد ہوتا ہے اور تھانوں کے لاک اپ میں بھی انہی کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔

اس کے برعکس اسلام نہ تو لوگوں کو دہشت گردوں کے حوالے کرتا ہے اور نہ ہی قانون کے محافظوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ شک کی بنیاد پر ملزم سے تشدد کے ذریعے اقبال جرم کروائیں اور پھر اس کی بنا پر عدالت سے سزا دلوائیں۔ اسلام سب سے پہلے اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرہ میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اول تو کسی کو جرم کا ارتکاب کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے اور اگر بالفرض وہ ایسا کر ہی بیٹھے تو وہ خود اپنے جرم کا اعتراف کرلے۔ ہماری عدالتیں جہاں پیشہ ور گواہوں کی بنیاد پر کسی کو سزا کا مستوجب قرار دیتی ہیں اسلام بیٹے اور غلام کی گواہی بھی قابل قبول نہیں گردانتا۔ اسلام چوری پر ہاتھ کاٹنے سے پہلے چاہتا ہے کہ لوگوں کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں اور زنا کے مجرم کو سزا دینے سے پہلے اس کا تقاضہ ہے کہ وہ تمام چور دروازے بند کر دیئے جائیں جن سے گزر کر لوگ اس جرم میں ملوث ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں جرائم کی ترغیب ہی نہیں باقاعدہ مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ ملک کی صورتحال یہ ہے کہ قوم کی ساری دولت چند خاندانوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور یہ خاندان سیاہ و سفید کے مالک ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس گلے سڑے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جس نے کروڑوں عوام کو چند خاندانوں کا غلام بنا دیا ہے۔ لیکن ہمارے رجال دین و سیاست کا یہ حال ہے کہ وہ اس نظام کے تحت قوانین شریعت نافذ کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کا فائدہ بھی دولت مندوں کو پہنچے۔ جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہے کیا ان کے ہاتھ کٹیں گے۔ چوری تو وہ کرے گا جو غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔

حکومتی سرپرستی میں ذرائع ابلاغ جو کچھ عوام کو دکھا رہے ہیں وہ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال ہے۔ OO

"شہیدِ مظلوم، حضرت عثمان غنیؓ" کے بعد مرکزی انجمن کی مطبوعات میں

ایک خوشگوار اضافہ

خلیفۂ رابع حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰؑ --- علیؓ مرتضیٰؓ

اب کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات ۵۲، عمدہ طباعت، قیمت (اشاعت عام) -/۷ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن

حکومتی سطح پر فحاشی اور عریانی کی حوصلہ افزائی افسوسناک ہے !

یہ کہنا بے بنیاد ہے کہ ناچ گانے عوام کی ضرورت بن چکے ہیں

شرم و حیا کا جنازہ نکال کر کس منہ سے پاکستان کو "پاکستان" کہیں گے !!

تحریر : محبوب الحق عاجز

یوں تو وطن عزیز کا ہر شعبہ زخموں سے چور ہے۔ بدعنوانی' لوٹ کھسوٹ' رشوت ستانی' ظلم و تشدد کا بازار ہر سو گرم ہے۔ سیاسی میدان میں مفاد پرستی اور سیاسی جماعتوں کی باہمی کشمکش ملکی مفادات کو داؤ پر لگانے کو تیار کھڑی ہے' معاشی شعبے میں دولت اور وسائل چند ہاتھوں میں جمع ہیں۔ غربت اور معاشی بدحالی کا عفریت ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ معاشرتی میدان میں سماجی عدم توازن اور معاشرتی اونچ نیچ گل کھلا رہی ہے' صوبائیت' لسانیت اور فرقہ واریت کے اژدہے ملک کو نگلنے کے درپے ہیں' عسکری شعبے میں ایٹمی پروگرام جاری نہ رکھنے سے خطرات کے سیاہ بادل ہماری سرحدوں پر منڈلا رہے ہیں۔ اور ہماری بقا و سلامتی خطرے سے دوچار ہے' قصہ مختصر ہر سو رستے ہوئے ناسور اس پاک دھرتی کی بربادی کی دہائی دے رہے ہیں' لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ جو ہمیں درپیش ہے' سب سے بڑا خطرہ جس کا ہمیں سامنا ہے' جس کا تذکرہ زبان زدعام ہے' جو عوام الناس کے لئے بالعموم اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے دین کے بہی خواہوں کے لئے بالخصوص سخت پریشانی اور اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے' وہ ہماری موجودہ میڈیا اور ثقافتی پالیسی کا مسئلہ اور خطرہ ہے۔ جس کے تحت ارباب اقتدار نے فحاشی و عریانی کی ترویج کی نہ صرف منظم مہم چلا رکھی ہے بلکہ گاہے بگاہے اس مہم کو مزید تیز تر کرنے کے عزم صمیم کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ چند روز قبل اسی سلسلہ میں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات جناب خالد احمد کھرل نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا "ملکی ثقافت اور تہذیب کی ترجمانی کرنے والے میلے ٹھیلے اور موسیقی کے پروگرام جاری رہیں گے" انہوں نے مزید کہا کہ

"ثقافتی پروگرام صرف اشرافیہ کا حق نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ عوام بھی نہ صرف ان پروگراموں سے لطف اندوز ہوں بلکہ ان میں شرکت بھی کریں" (نوائے وقت ۲۱ مارچ)

کچھ عرصہ قبل بھی وزیر موصوف نے سروسز اکیڈمی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"پاکستان میں جو لوگ ناچ گانے دیکھنا پسند نہیں کرتے انہیں اپنے ٹی وی بند کر دینے چاہئیں' کیونکہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو انہیں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ جو ان کا جمہوری حق ہے' جس پر ہم یقین رکھتے ہیں"۔

اسی طرح کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا

"ڈانس ہماری ثقافت کا حصہ ہے"۔

ہم وزیر موصوف اور ان کے دیگر فکری ہم نواؤں کی خدمت میں فکری اصلاح کی غرض سے بنیادی حقائق پر مبنی چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ع شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات!

موسیقی کے موجودہ پروگرام اور میلے ٹھیلے ہماری ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں' اس کا جواب دینے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی صراحت کر دی جائے کہ ثقافت کا معنی و مفہوم کیا ہے نیز ہماری ملکی ثقافت کیا ہے؟ تاکہ بات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے تو اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ

"معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق اور فنی مہارت سے متعلقہ وہ امور جو معاشرے کا لازمی حصہ ہوں اور معاشرے کی شناخت کا باعث ہوں مجموعی طور پر معاشرہ کی ثقافت کہلاتے ہیں"۔

اور ہماری ملکی ثقافت کیا ہے؟ تو اس کا دو لفظی جواب "اسلامی ثقافت" ہے۔ اس لئے کہ جس نظریے پر اس وطن کی تعمیر ہوئی' جس نظریے کے تحفظ کی خاطر مسلمانان ہند نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے' جس کی بقا کی خاطر ہماری ماؤں بہنوں کو اپنی عصمتوں کی قربانیاں دینا پڑیں' جس کی حفاظت کے لئے معصوم بچوں کو تیغوں کی انیوں پر لٹکایا گیا' جس نظریے کے بالفعل نفاذ و قیام کی خاطر ہمارے بزرگوں' نوجوانوں بچوں اور عورتوں نے آگ اور خون کا دریا عبور کر کے اس دھرتی پر قدم رکھا وہ اسلام کا نظریہ ہے' لہٰذا یہ بات واضح ہے پاکستان کی حقیقی ثقافت اسلامی ثقافت ہے۔

گویا اب اصل سوال یہ ہے کہ اسلامی ثقافت کیا ہے؟ جس طرح مختلف تہذیبیں طرز معاشرت میں مخصوص احکام دیتی ہیں اور ان احکامات کی تعمیل کے نتیجے میں اس تہذیب کے زیر اثر تشکیل پانے والی ثقافت کا اظہار ہوتا ہے' اسی طرح دین اسلام نے بھی

> "جہاں تک وزیر موصوف کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ناچ گانے دیکھنا پسند کرتا ہے اور یہ ان کا جمہوری حق ہے۔ تو اس ضمن میں پہلی بات تو ہم یہ عرض کریں گے کہ بحمداللہ پاکستان میں ایسا طبقہ کوئی نہیں ہے جسے فی الواقع طبقہ کہا جا سکے' کہ جو ناچ گانے کو اسلامی تعلیمات پر ترجیح دیتا ہو"

انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کا ایک لائحہ عمل اور سلیقہ عطا کیا ہے۔ اس نے عائلی زندگی' معاشرتی اور سماجی زندگی' قومی اور بین الاقوامی زندگی کے متعلق واضح احکامات دیئے ہیں' اسی طرح نشست و برخاست' رہن سہن' لباس اور وضع قطع' فن تعمیر اور ادب وغیرہ کے متعلق خاص نوعیت کی تعلیمات پیش کی ہیں۔ ان جملہ تعلیمات اور احکامات پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہماری زندگی کا جو بھی عملی نقشہ سامنے آتا ہے اور جو سیرت و کردار تشکیل پاتی ہے اسے "اسلامی ثقافت" کہا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں اس سوال کا جواب دینا کہ

"جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے تو اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ "معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق اور فنی مہارت سے متعلقہ وہ امور جو معاشرے کا لازمی حصہ ہوں اور معاشرے کی شناخت کا باعث ہوں مجموعی طور پر معاشرہ کی ثقافت کہلاتے ہیں"

موجودہ موسیقی کے پروگرام اور میلے ٹھیلے ہماری ملکی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں' زیادہ مشکل نہیں ہے بشرطیکہ ملکی ثقافت کے حوالے سے ہمارا ذہن کھلا ہو۔ اگر ہمارا ذہن واضح نہیں اور ہم پاکستانی ثقافت کو اسلامی ثقافت سے علیحدہ کوئی چیز قرار دینے پر مصر ہیں تو یہ بات ہی دوسری ہے لیکن یہ سوچ اسلام اور نظریہ پاکستان کی سراسر نفی کے مترادف ہے' البتہ اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی ثقافت اسلامی ثقافت ہی ہے تو پھر وزیر موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس موسیقی کو وہ ہماری ثقافت کا ترجمان قرار دے رہے ہیں اس (معازف و مزامیر) کو تو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ رہے میلے ٹھیلے تو وہ اگر اسلامی ضابطہ اخلاق کے مطابق ہوں تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ میلے نام نہاد کلچرل پروگراموں' لڑکے لڑکیوں کے مخلوط رقص' شراب نوشی' عشق و معاشقے کے ڈائیلاگ پر مشتمل ہوں تو یہ میلے ہماری ثقافت کا مظہر نہیں ہو سکتے۔ پوری اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں یا خلافت راشدہ کے زریں دور میں کہیں اس نوع کے میلوں کا وجود ملتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ٹی وی کے موجودہ پروگرام حکومتی سرپرستی میں ہونے والے کلچرل پروگرام اور میوزیکل شو وغیرہ ہندی ثقافت (جیسا کہ سونیا گاندھی نے کہا ہے کہ ہم نے ثقافتی جنگ جیت لی ہے (روایت بالمعنی)) حکومتی ثقافت مغربی ثقافت کا مظہر تو ہو سکتی ہے لیکن اسلامی اور پاکستانی ثقافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں' ہمارے رہنے سہنے کے ڈھنگ' انداز نشست و برخاست' یا دوسرے تفریحی مشاغل اسی حد تک قابل قبول ہو سکتے ہیں جس حد تک اسلام اجازت دیتا ہے۔

جہاں تک وزیر موصوف کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ناچ گانے دیکھنا پسند کرتا ہے اور یہ ان کا جمہوری حق ہے۔ تو اس ضمن میں پہلی بات تو ہم یہ عرض کریں گے کہ بحمد اللہ پاکستان میں ایسا طبقہ کوئی نہیں ہے جسے فی الواقع طبقہ کہا جا سکے' کہ جو ناچ گانے کو اسلامی تعلیمات پر ترجیح دیتا ہو' البتہ ایک مغرب زدہ محدود اقلیت ضرور موجود ہے' جو ہر معاملے کو مغرب کی عینک سے دیکھتی ہے اور جسے اسلام کی تعلیمات سے خواہ مخواہ کی چڑ ہے' جو ناچ گانے پسند کرتی ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس اقلیت کی پسند (ناچ گانوں) کو ایک عظیم اکثریت پر زبردستی مسلط کرنا کہاں کی جمہوریت ہے؟

دوسرے یہ کہ ناچ گانے وغیرہ کو اگر کسی مغربی سیکولر ملک میں عوام کا جمہوری قدروں کا جنازہ نکالا جا چکا ہے' ہم جنس پرستی' مخلوط معاشرت' جنس آزادی وہاں کا کلچر ہے لیکن ہمارے ہاں اللہ کا شکر ہے ابھی تک یہ صورت حال پیدا نہیں ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ انتہائی عملی انحطاط اور فکری زوال کے باوجود ہمارے غیور مسلمان کسی کسی ایسی شے کو اپنے حقوق کی فہرست میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں جو دین و اخلاق کے منافی ہو۔

تیسرے یہ کہ یہ حقوق مغربی جمہوریت میں تو عوام کو حاصل ہو سکتے ہیں کہ اس جمہوریت میں "Sovereign" عوام ہیں لیکن یہاں آئینی اعتبار سے مغربی طرز کی سیکولر جمہوریت نہیں ہے۔ پہلی دستور ساز اسمبلی نے اجتماعی طور پر ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد منظور کی۔ جس میں حاکمیت الٰہی کا اقرار کیا گیا' لہٰذا اب جو بھی اس کے برعکس سوچتا ہے وہ اس ملک کی اساس کے درپے ہے۔ ثقافت اور کلچر کے نام پر ناچ گانے اور فحاشی و عریانی کی ترویج درحقیقت اس ملک کی جڑ کاٹنا ہے۔

جمہوری حقوق کی بات چل ہی نکلی ہے تو ہم ارباب اقتدار سے بھی یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فحش' بے ہودہ اور لچر پروگرام دیکھنا ہی جمہور کا حق رہ گیا ہے؟۔ کیا اہل پاکستان کے اور کوئی حقوق نہیں ہیں؟ کیا وہ لوگ جنہیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں ہے' اور جن کے بچے کچرے کے ڈھیروں سے روکھی سوکھی چن کر گزارا کرتے ہیں' کیا روٹی ان کا حق نہیں ہے؟ ہمارے ملک میں اشرافیہ طبقہ کے بچے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں' لیکن غریبوں کے بچے اول تو تعلیم سے محروم رہتے ہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو کھلے میدان میں' کھلے آسمان تلے' چھت کا سایہ نصیب نہیں ہوتا' کیا یہ بچے انسان نہیں ہیں' کیا یہ کسی اور اللہ کی مخلوق ہیں' کیا یہ پاکستانی نہیں ہیں؟ کیا تعلیم ان کا حق نہیں ہے؟ جو لوگ بستر علالت پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے ہیں' علاج معالجہ ان کا حق نہیں ہے؟ بیٹیاں غربت اور اونچ نیچ کا شکار رہ کر جوانی بتا دیتی ہیں۔ کتنے ہی مظلوم انسان دیہاتوں میں جاگیرداروں کے ظلم کی چکی میں تاحیات پستے رہتے ہیں۔ ان کی پکار پر' ان کی فریاد پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ کوئی ان پہ ہونے والے ظلم کی داد رسی نہیں کرتا۔ کیا ان کو ظلم و استبداد سے نجات دلانا اور انصاف فراہم کرنا حکومت کا کام نہیں؟۔

اگر یہ سب عوام کے حقوق ہیں (اور یقیناً ہیں لیکن عوام کو میسر نہیں) تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وزیر اطلاعات و نشریات جمہوری حقوق کے نام پر عریانی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اگر وہ عوام کے حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد ہیں تو انہیں چاہئے کہ ریڈیو' ٹی وی کو صحت مند تفریح کا ذریعہ بنائیں تاکہ معاشرے میں اسلامی اقدار اور روایات کو فروغ حاصل ہو۔ ثقافت کسی قوم کی شناخت ہوتی ہے مثلاً اگر کسی شخص کے سر پر جوڑا اور خاص طرز کی پگڑی' گلے میں کرپان اور ہاتھ میں کڑا ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سکھ ہے۔ اور قبا کے ساتھ سر پر رومال اور عقال باندھے ہوئے شخص کو عرب کہیں گے لیکن ہماری شناخت اسلام کے سوا کوئی بھی نہیں ہے اس لئے کہ ہم اسلام کی بنا پر الگ قوم بنے ہیں۔

ہم ملک کے سنجیدہ اور دردمند افراد سے بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہم سے شرافت بالکل چھن چکی ہے

ضروری نہیں کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہرائے !!

مسائل میں گھرے ہوئے ممالک اچھے ہمسائے ثابت نہیں ہوتے

ممکن ہے کہ کل چین وہ نہ رہے جو آج نظر آرہا ہے

دو عالمی جنگوں اور لاتعداد اموات کے بعد کہیں جا کر موجودہ عالمی نظام قائم ہوا ہے

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

موجودہ صدی ختم ہونے کو ہے عالمی منظر پر اس کے نصف آخر سے ایک ہی بڑی طاقت کو فوقیت حاصل ہے۔ ایک وقت تھا اس کی معیشت عروج پر تھی، فن سپاہ گری میں اسے فیصلہ کن برتری حاصل تھی لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔ ایک طرف تجارت میں کمی واقع ہوئی ہے تو دوسری طرف پوری دنیا میں اس کی پھیلی ہوئی طاقت کا اس جگہ برقرار رہنا دشوار نظر آتا ہے۔ سمندر پار بے پناہ آبادی والا ایک ملک موجود ہے جس کی معیشت دنیا میں عجوبے سے کم نہیں۔ گوناگوں مسائل سے دوچار یہ ملک اپنی حیثیت منوانا چاہتا ہے، ہتھیاروں کی دوڑ میں اس کی شرکت کے باعث اس خطے میں پرانی رقابتیں سر اٹھانے لگی ہیں۔

دو عالمی جنگوں اور لاتعداد اموات کے بعد کہیں جا کر موجودہ عالمی نظام قائم ہوا ہے اس نظام کے پیچھے برطانیہ اور جرمنی کی پوری ایک صدی کی محاذ آرائی ہے۔ جنگی فن کے ماہرین کے سامنے ایک ایسا سوال ہے جس نے ان کی نیند حرام کر رکھی ہے اور وہ یہ کہ کیا اگلی صدی میں یہ واقعہ امریکہ اور چین کے درمیان دہرایا جانے والا ہے؟ بعض پہلوؤں سے ان دونوں کا دنیا میں اہم معاشی مقام ہے۔ جہاں تک نظر آتا ہے مستقبل میں چین دنیا کا سب سے زیادہ آبادی کا ملک ہوگا امریکہ اس کے مقابلے میں تیسرے نمبر پر ہوگا۔ امریکہ اوپر سے کو نیچے آرہا ہے جس کو بدلنا محال ہے جبکہ چین تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ چین اپنی دفاعی افواج کو جدید طرز پر لا رہا ہے اس کی جاہ طلبی ایشیاء میں جنوبی کوریا جاپان اور فلپائن جیسے امریکہ کے دوست ممالک کے مفادات کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتی ہے۔ جس طرح ولہلمائن Wilhelmine کے دور میں جرمنی کو شکایت تھی ہو سکتا ہے چین نے بھی دل میں بہت سے غموں کو پال رکھا ہو کہ اس کے ساتھ نادرا سلوک کیا گیا ہے۔ لندن میں قائم انسٹی ٹیوٹ آف سٹرٹیجک سٹڈیز کے جیرالڈ سیگل کا کہنا ہے کہ چین نے کنکر، ریزے نہیں پورا پتھر کندھے پر لے رکھا ہے۔

> "ولہلمائن کے دور میں جرمنی اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا جس سے آج چین بڑھ رہا ہے، انتہائی تہذیب یافتہ ملک تھا اور اس کے ہاں ترقی یافتہ اور پختہ سیاسی ادارے موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی شے بھی اسے جنگ سے باز نہ رکھ سکی"

مسائل میں گھرے ہوئے ممالک اچھے ہمسائے ثابت نہیں ہوتے چین کے بارے میں مرکزی سوال یہ ہے کہ آیا آئندہ وہ جارحیت پر مبنی قوم پرستی کا مظہر ہوگا؟۔ چین کی وسیع آبادی جو موجودہ ایک اعشاریہ دو بلین (ارب) سے بڑھ کر ۲۰۲۵ء تک ڈیڑھ بلین تک جا پہنچے گی خاص طور سے مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ چین میں پہلے ہی اناج کی کمی ہے اور اگلے چند برسوں میں اسے کثیر مقدار میں غلہ درآمد کرنا پڑے گا۔ مزید برآں اتنی بڑی آبادی کے ساتھ معاشی ترقی کے نتیجے میں توانائی کی ضروریات میں ملک کے اندر فراہم ہونے والی توانائی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

جن ممالک کو خوراک اور تیل کی کمی کا سامنا ہوتا ہے ان کا ردعمل صرف جنگ کی تیاریوں تک محدود نہیں رہتا۔ ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کی دہائیوں کی تباہی کی راہ چھوڑ کر جاپان فتوحات کی بجائے مضبوط معیشت کے ذریعے اپنی ضروریات پوری کرنے میں مصروف ہے اس کے برعکس امریکہ کھلے عام کہتا ہے کہ خلیج عرب سے تیل کی فراہمی میں رکاوٹ پیش آنے پر وہ جنگ کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا، گویا چین کے سامنے آئندہ جاپان اور امریکہ دونوں کی مثالیں موجود ہیں اگرچہ ایک لحاظ سے اس نے تیل سے مالامال جنوبی بحیرہ چین کو پوری طرح اپنے تسلط میں لینے کی تیاریوں سے اس کا خاطرخواہ جواب دے دیا ہے۔ کہ وہ کون سی راہ اختیار کرے گا۔

ممکن ہے کہ کل کو چین وہ نہ رہے جو آج نظر آرہا ہے۔ چین کے پیش نظر صرف اپنی طاقت کا مظاہرہ ہو جدید اسلحہ کی تیاری اور جنوبی بحیرہ چین میں اس کی مہم جوئی کے حوالے سے سردست یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے مگر آنے والی دہائیوں میں اسے اپنے محدود وسائل سے بہت سی دیگر ضروریات پوری کرنا ہوں گی اور فوجی طاقت کے ڈراوے پر پیسہ خرچ کرنا آسان نہیں ہوگا جبکہ دھاک بٹھانے کے لئے طیارہ بردار بحری جہازوں کی خریداری یا تعمیر اور ترقی یافتہ ہوائی فوج کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چین میں قانون کی حکمرانی کا حامی دھڑا ہیجانی دور سے گزر کر اندرونی سیاست میں حقیقی طاقت قائم کر لے۔ بین الاقوامی تعلقات کے قواعد و ضوابط چین کو

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

محترمی برادرم عاکف صاحب' اسلام علیکم ورحمتہ اللہ

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ایک عرصہ سے ارادہ کرتا تھا کہ مفصل خط تحریر کروں مگر اب تک اس کا موقع نہ مل سکا یوں بھی طبیعت آسانی سے لکھنے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ البتہ آج سوچا کہ مختصراً ہی سہی لیکن اپنے کچھ خیالات آپ کی خدمت میں تحریر کر دوں۔ الحمدللہ جب بھی "ندائے خلافت" کا پرچہ ہاتھ میں آتا ہے تو بے اختیار آپ کے لئے اور آپ کی پوری ٹیم کے لئے دعائیہ اور تحسین کے کلمات زبان پر آ جاتے ہیں۔ اس دوران شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جو نظر سے اس طرح گزرا ہو کہ لفظ بلفظ شروع سے اخیر تک اس کا مطالعہ نہ کیا ہو آپ کی لیڈر شپ میں یقیناً اس جریدے نے ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ بلا تامل اب یہ اپنی Maturity کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ایک عرصہ سے اس میں شاید ہی کوئی بھرتی (filler) کا آرٹیکل شائع ہوا ہو۔ تمام مضامین لائق توجہ ہوتے ہیں۔ ان میں تنوع اور عمومی دلچسپی (دعوت و تحریک اور فکر و نظر سے متعلق احباب کے لئے) سامان ہوتا ہے۔ شعبہ ترجمہ کی کارکردگی بھی نہایت عمدہ ہے۔ محترمی سردار اعوان صاحب خصوصی تحسین کے مستحق ہیں۔ + یوں تو آپ کے طبع زاد مواد کی سلیکشن بھی خوب ہے تاہم شمارہ نمبر ۵ میں "جنگ" کے حوالے سے شائع شدہ ڈاکٹر خالد حسین جلیس کا مضمون ایک Exception ہے۔ موصوف کے مضمون پر مفصل تنقید کا ادارہ تھا لیکن شاید یہ مصنف تک نہ پہنچ سکے اور دوسرے یوں بھی یہ ندائے خلافت کا orignal آرٹیکل نہیں ہے۔ مختصراً یہ کسی بھی لحاظ سے ندائے خلافت میں شائع ہونے کے لئے معیاری آرٹیکل نہ تھا۔ سب سے اخیر میں' میں یہ جذبات بھی آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ نہ جانے کیوں ندائے خلافت کے ہر تازہ شمارے کے ساتھ محترم افتخار احمد مرحوم کی یاد سے دل مہک اٹھتا ہے۔ شاید یہ سلسلہ میرے جیسے کئی ندائے خلافت کے قارئین کے دل میں جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ آپ نے یقیناً ندائے خلافت کے جاری رہنے اور اس کا معیار بلند رکھنے میں ان کی نیابت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اپنی بد خطی اور بے ربط تحریر کی معذرت چاہوں گا۔ والسلام

طالب دعا

راحیل ملک' اسلام آباد

ورلڈ کپ کرکٹ نامہ ..... "ہم جیتیں گے"!!

(بنگلور --- بھارت)

ایک نظم جو خالص فنی اعتبار سے اساتذۂ فن کے معیار پر تو شاید پوری نہیں اترتی' تاہم اس میں ہماری قوم کی اصل حقیقت کی نقشہ کشی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ادارہ

ہم جیتیں گے.....ہم جیتیں گے!

ہم "ان شاء اللہ" کیوں بولیں' ہم جیتیں گے
یوں اپنی زبانیں کیوں کھولیں' ہم جیتیں گے

میرٹ کو ملک بدر کر کے' ہم جیتیں گے
رشوت کو نگر نگر کر کے' ہم جیتیں گے

ہم اپنے پن سے شرمائیں' ہم جیتیں گے
اور گن مغرب ہی کے گائیں' ہم جیتیں گے

اپنی ہی خودی کے انکاری' ہم جیتیں گے
سب پر گوریت ہے طاری' ہم جیتیں گے

ہم مشرق کے سب پالے ہیں' ہم جیتیں گے
نزد انگریز ہم کالے ہیں' ہم جیتیں گے

ہم بے نظمی کے مارے ہیں' ہم جیتیں گے
بے وجہ نہیں ہم ہارے ہیں' ہم جیتیں گے

جنس اور گٹار کی بات چلے' ہم جیتیں گے
ناچ اور تالی دن رات چلے' ہم جیتیں گے

بن آئی نسل نو پر ہے' ہم جیتیں گے
فردا ہے کہاں انکا ... گر ہے' ہم جیتیں گے

ہر مانگے تانگے فنکشن پر' ہم جیتیں گے
اور پردۂ ٹیلی ویژن پر' ہم جیتیں گے

عورت کا استحصال کریں' ہم جیتیں گے
اور اس کی خودی پامال کریں' ہم جیتیں گے

عورت تو نہیں "کلچر ٹوائے" ہم جیتیں گے
مکر مرداں' ہائے ہائے' ہم جیتیں گے

میلوں ٹھیلوں کی رعنائی' ہم جیتیں گے
نہ ہاتھ آئی' نہ کام آئی' ہم جیتیں گے

آؤ ہمدم کچھ ہوش کریں' ہم جیتیں گے
رنج فردا و دوش کریں' ہم جیتیں گے

یہ قوم مری کب جانے گی' ہم جیتیں گے
خود کو کب پہچانے گی' ہم جیتیں گے

اپنے نظریے کا پرچم' ہم جیتیں گے
رکھیں اونچا' ہر آن ہر دم' ہم جیتیں گے

ہم اصل میں فاتح عالم ہیں' ہم جیتیں گے
ہم مسلم ہیں' ہم تو ہم ہیں' ہم جیتیں گے

ہم ان شاء اللہ جیتیں گے
ہم ان شاء اللہ جیتیں گے

(کفایت محی الدین' ڈھکی' ڈیرہ اسماعیل خان)

☆☆☆

بقیہ : "جلسہ عام"

لیکن افسوس کہ انہیں اس شادی کے ذریعے عالمی صیہونیت نے اپنے ۱۷۷۶ء سے قائم "آرڈر آف ایلومیناٹی" کی مستقل پالیسی کے تحت "ہائی جیک" کر لیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے خسر بہت بڑے سرمایہ دار اور فعال صیہونی ہیں۔ تاہم میں نے اپنی اسی تقریر میں یہ دعا بھی کی تھی کہ اللہ انہیں توفیق دے کہ وہ ع "ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں!" کے مصداق اس جال سے ثابت و سالم نکل آئیں --- البتہ حال ہی میں انہوں نے ہسپتال کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے لیڈی ڈائنا کی رونمائی کو ذریعہ بنا کر ثابت کر دیا ہے کہ ان پر مغربی اور صیہونی گرفت تاحال بہت مضبوط ہے اور اسی کا ایک مظہر شاید یہ بھی ہے کہ "ٹائم" کے مذکورہ بالا مضمون کا جو ٹائٹل ۲۷/ مارچ کو فہرست میں درج کیا گیا تھا وہ تھا "THE LION'S NEW ROAR" جبکہ ۱۷/ اپریل کو جو مضمون شائع ہوا اس کا عنوان ہے "WILL THE LOIN ROAR AGAIN?"

بہرحال ہمیں ع "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!" کے مصداق دعا کرتے رہنا چاہئے کہ وہ جلد از جلد اس پھندے سے نکل آئیں۔ اگرچہ ساتھ ہی حقائق سے صرف نظر اور واقعات سے غض بصر کرنا بھی درست نہیں ہے!

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

بقیہ : واقعات عالم

راس نہیں آئیں گے اور اسے معاشی مفادات کے لئے جارحانہ رویہ اختیار کرنا پڑے گا البتہ وہ جنگجوئی سے گریز کرے گا۔ مایوس قسم کے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ واسلمائن کے دور میں جرمنی اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا جس سے آج چین بڑھ رہا ہے' انتہائی تہذیب یافتہ ملک تھا اور اس کے ہاں ترقی یافتہ اور پختہ سیاسی ادارے موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی شے بھی اسے جنگ سے باز نہ رکھ سکی۔ چین خواہ اپنا رویہ نرم رکھے یا سخت' ایشیاء میں چین کے غلبے سے بچاؤ کا واحد ذریعہ امریکی طاقت ہے۔ ایک حد تک یہ بات چین کے حق میں ہے' بجائے اس کے دوبارہ جاپان عسکریت کی جانب مائل ہو' اس خطے میں امریکہ کی موجودگی بہتر ہے درحقیقت امریکہ' جاپان اور چین کے باہمی مفادات طویل عرصے سے ایشیائی محققین کے نزدیک امر واقعہ ہیں۔

عسکری موضوع پر ان پیچیدہ مباحث میں نئی بات جو شامل ہوئی ہے وہ امریکہ' چین اور روس سے قائم ہونے والی تکون ہے۔ وقتی طور پر روس کا جھکاؤ چین کی طرف ہو سکتا ہے اس لئے کہ روس کو اپنی پہلے سے قائم طاقتور دفاعی صنعت کے لئے مارکیٹ درکار ہوگی اور چینی فوج کو جدید بنانے میں ماسکو اہم کردار ادا کر سکتا ہے لیکن آگے چل کر چین اور روس کی آپس کی دشمنی ڈھکی نہیں رہ سکے گی ان کے درمیان سرحدی جھگڑے چل رہے ہیں۔ روس کا غیر آباد (مگر متوقع طور پر وسائل سے مالا مال) آخری مشرقی حصہ کسی روز چین کے لئے زبردست کشش کا باعث بن سکتا ہے۔ اس وقت امریکہ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ تاریخ میں ایسی ہی تکلیف دہ ایک مثال پہلے بھی ہے۔ ۱۹۰۰ء سے قبل ۵۰۰ برسوں میں زیادہ تر فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے ازلی دشمن بنے رہے لیکن ۱۹۰۰ء سے فرانس اور برطانیہ جرمنی کے خلاف اتحادی بن گئے۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو نہیں دہراتی لیکن کبھی کبھی دہرا بھی لیتی ہے۔

(بشکریہ : نیوز ویک)

بلا تبصرہ

لندن : پاکستانی کرکٹر عمران خان اور برطانوی مسلم یوسف اسلام' سابقہ کیٹ سٹیونز (Cat Stevens) نے باہم مل کر انگلینڈ اور پاکستان میں تعلیمی منصوبوں کے لئے فنڈ جمع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یوسف اسلام یو۔ کے اسلامک ایجوکیشن وقف (یو۔ کے۔ آئی۔ ای۔ ڈبلیو) کے چیئرمین ہیں اور "دی مسلم ایڈ" کے نام سے ایک خیراتی ادارہ چلا رہے ہیں۔ یہ ملاقات برطانیہ کے امیر ترین شخص' عمران خان کی اہلیہ جیمیما خان کے والد مسٹر گولڈ سمتھ کے گھر پر جیمیما خان کی موجودگی میں ہوئی۔ عمران خان لاہور میں شوکت خانم کینسر میموریل ہسپتال چلا رہے ہیں۔

ان دونوں نے یو۔ کے اور پاکستان میں ایک دوسرے کو ان کے منصوبوں میں مدد بہم پہنچانے کا عہد کیا۔ عمران خان پاکستان میں ناخواندگی کے خاتمے کی ایک مہم کا آغاز کر رہے ہیں جبکہ یو۔ کے۔ آئی۔ ای۔ ڈبلیو پاکستان میں اسلامی تعلیم عام کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

Imran Khan and Yusuf Islam Join Hands

LONDON: Pakistani cricketer Imran Khan and British Muslim Yusuf Islam, formerly Cat Stevens, have decided to jointly raise funds for educational projects in England and Pakistan. Yusuf Islam is the chairman of the UK Islamic Education Waqf (UKIEW) and runs the charitable organisation The Muslim Aid. The meeting was held in the presence of Khan's newly married wife Jemima Khan at house of Jemima's father Mr. Goldsmith, one of England's richest men. Imran Khan runs the Showkat Khanam Cancer Hospital in Lahore.

They both agreed to support each other's ventures in the U.K and Pakistan. Imran has embarked on a venture to eradicate illiteracy in Pakistan while the UKIEW furthers Islamic education in UK.

اسلامک وائس (مارچ ۹۶ء) میں شائع شدہ خبر کا متن

وہاں ہر شخص محبت و شفقت کا پیکر نظر آیا

رمضان کی ۲۷ ویں شب بیت اللہ میں لاکھوں مسلمان جمع تھے

سعودی عرب اور امارات میں نظم و ضبط اور امن و امان مثالی ہے

تحریر : رحمت اللہ بیٹر

امسال سالانہ اجتماع کے بعد جب تربیت گاہوں کا شیڈول بنایا گیا تو میرے لئے رمضان المبارک میں امارات کا پروگرام رکھا تھا کہ وہاں پر جمعیت خدام القرآن کے ساتھیوں سے ملاقات اور تبادلہ خیالات ہو سکے۔ لیکن بعد میں تقاضا ہوا کہ میں رمضان المبارک کے فوراً بعد امارات آؤں۔ میں نے اسے اپنے لئے سعادت سمجھا کہ اس طرح رمضان میں حرمین میں حاضری بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ ۱۵ رمضان المبارک کو بندہ عمرہ کی نیت سے جدہ روانہ ہوا۔ ۱۶ رمضان المبارک کو جدہ میں ایک افطاری کا پروگرام تھا جس میں حاضری ہوئی اور احباب کے سامنے عبادت رب اور شہادت علی الناس کے فرائض کے حوالے سے ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو کا موقعہ ملا۔ حجاز میں رمضان المبارک کا سماں ہی کچھ اور ہوتا ہے اکثر لوگ راتوں کو جاگتے ہیں اور دن کو ڈیوٹی بھی دیتے ہیں لیکن دن کے وقت عموماً بازار سنسان ہوتے ہیں۔

عمرہ کے بعد مدینۃ النبیؐ بھی حاضری دی۔ مسجد نبویؐ میں تو حج کے دنوں سے بھی بڑھ کر لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور پھر افطاری کیلئے نماز عصر کے فوراً بعد سے دستر خوان بچھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ رات کو قرآن مجید کے ساتھ قیام بہت ہی دلکش ہوتا ہے قرآن مجید ترتیل کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور عربوں کی زبان میں تلاوت تو ایسا لطف دیتی ہے کہ سیدھا دل پر نزول محسوس ہوتا ہے۔ بیسویں روزہ سے حرم بیت اللہ میں اعتکاف کی نعمت زندگی میں پہلی دفعہ نصیب ہوئی۔ محسوس ہوتا ہے کہ تمام دنیا سے طالبان و بخشش ہدایت یہاں ہی جمع ہو گئے ہیں۔ قرآن مجید نوافل تراویح میں اور پھر رات کے پچھلے پہر دوبارہ پورے قرآن مجید کا دورہ تو نعمت غیر مترقبہ تھی۔ وتروں میں دعا جو جوف اللیل الاخر میں ہوتی تھی یقیناً بارگاہ الٰہی میں قبولیت کے یقین کے ساتھ توشہ آخرت بن رہی تھی۔

مختلف رنگ، نسل، زبان رکھنے والے سب یک زبان ہو کر اللہ کے حضور سجدہ ریز تھے اور ہاتھ اٹھا کر رحمت خداوندی کے طالب تھے۔ باہمی اخوت و یک رنگی اور ایک امت ہونے کا شعور یہیں حاصل ہوتا ہے جہاں مختلف مسالک کے باوجود ایک امام کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی کوتاہیوں اور محتاجی کا اعتراف ہو اور اس کی رحمت اور درگزر کے وعدہ پر یقین رکھتے ہوئے دست دعا دراز ہو' خاص کر طاق راتوں میں تو حجاز کے کونے کونے سے لوگ شب بیداری کیلئے کھنچے چلے آرہے تھے یہاں تک کہ پورا حرم بھر جاتا تھا۔ ستائیسویں شب کو تو تیس پینتیس لاکھ انسانوں کا اجتماع تھا لیکن مجال ہے کہ کسی کو کسی سے کوئی شکایت ہو یا کسی سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہو۔ ہر شخص سراپا محبت و شفقت کا پیکر تھا۔ عید کے بعد پندرہ دن امارات میں اللہ کی کتاب کے بیان اور اس کی باہم تفہیم میں ایسے گزرے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ساتھیوں کے شوق کی وجہ سے چھ چھ گھنٹے کے پروگرام بھی یوں گزر گئے کہ تھکان کا احساس تک نہ ہوا۔ میرے لئے تو اس پورے عرصہ میں ساتھیوں کی طرف سے خاطر و مدارت اور عزت افزائی کا معاملہ ایسا رہا کہ ساری زندگی اس کی یاد نہیں بھول پائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام ساتھیوں کو ان کی محنت و دین کے لئے بھاگ دوڑ اور میرے ساتھ تعاون پر اجر عظیم فرمائے اور اسے توشہ آخرت بنائے۔

اس وقت عالمی سطح پر بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ دنیا بھر میں مسلمان حکمران بے بسی کی تصویر بنے امریکہ کے سامنے دست بستہ نظر آتے ہیں۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے' تو اپنے ممالک میں ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف غیر مسلم ہی نہیں مسلم حکمران بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس صورت حال پر آدمی دل مسوس کر رہ جاتا ہے لیکن یہاں اس بات کا اعتراف کئے بنا نہیں رہا جاتا کہ سعودی عرب اور امارات کا علاقہ نظم و ضبط اور امن و امان کے لحاظ سے شاید پورے عالم اسلام میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص کر اپنے ملک کے حالات دیکھتے ہوئے عرب بھائیوں سے یہ التجا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا کے لئے "جمہوریت" اور "حقوق" کی تمنا نہ کرنا۔ مانا کہ اسلام میں بادشاہت اور شیخیت کی کوئی گنجائش نہیں لیکن وہ نام نہاد جمہوریت جن کا تجربہ ہم اہل پاکستان کو ہو رہا ہے اس سے بدتر شے دنیا میں کوئی نہیں۔○○

بالا دستی

وزیر اعظم صاحبہ نے اسیروں کو سپیکر قومی اسمبلی اور چیئرمین سینٹ کی طرف سے ایوان میں لانے کے احکامات صادر کرنے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پارلیمنٹ سپریم نہیں ہے' متعلقہ فریق عدالت سے رجوع کریں۔ اس وقت تک عدالتوں کو سیاسی دھند میں لپیٹا جا چکا تھا' کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بالادستی کا یہ نعرہ ایک سال کے اندر اندر ریورس گیئر لگا لے گا۔ پی پی پی حکومت کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ جو بھی اس کے غیر جمہوری اقدامات اور انتقامی روش میں مدد و معاون ثابت ہو وہ بالادست ہے' سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلے کے ذریعے حکومت کی بے لگام خواہشات کو لگام دینے کی کوشش کی تو حکمرانوں کو عدلیہ کی بجائے پھر پارلیمنٹ کی بالادستی یاد آگئی جس کے بارے میں ایک سال پہلے کہہ رہے تھے کہ وہ سپریم نہیں ہے۔

(خالد سلطان - خبریں)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

دولت کی یہ ریل پیل سدا رہنے والی نہیں !

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

آج جن کو ملزم گردانا جارہا ہے کل تک وہ جنوبی کوریا کے صدر تھے

وہ وقت آکر رہے گا کہ لوگ حکمرانوں کا گریبان پکڑیں گے

ایک مختلف نوع کا مقدمہ ان دنوں جنوبی کوریا کی ایک عدالت میں زیر سماعت ہے۔ جنوبی کوریا کے درجنوں شہری رات پھر عدالت کے باہر اس انتظار میں پہرہ دیتے رہے ہے کہ ۵۰۰ ڈالر فی نشست ادا کر کے پہلے دن کی سماعت کا نظارہ کر سکیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقدمے میں کون سی ایسی کشش ہے کہ لوگ کھنچے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آج جن کو ملزم گردانا جا رہا ہے کل وہ جنوبی کوریا میں صدر کے عہدہ پر فائز تھے' یعنی صدر چن ڈوہوان (Chun Doo-hwan) اور ان کے بعد آنے والے صدر روہ ٹائی وو (Roh Tae Woo)۔ ان دونوں کے علاوہ چودہ دوسرے سابق جنرل بھی اس مقدمہ میں ملوث ہیں۔ ان سب پر بغاوت اور سازش کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ چن اور روہ نے اپنے ۱۶ سالہ دور اقتدار میں جو کچھ کیا اسی کو الزامات کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ روہ اور چودہ دوسرے جنرلوں سمیت چن نے دسمبر ۱۹۷۹ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ چند ماہ بعد مئی ۱۹۸۰ء میں کوانجو (Kwangju) کے شہر میں فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے جس پر فوج نے ۲۰۰ مظاہرین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چن اور روہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایسا ملکی مفاد میں کیا تھا لیکن انہیں شاید ابھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ سماعت کرنے والے ججوں نے انہیں مجرم قرار دے دیا

> "کوئی عجب نہیں کہ ایشیاء کی مشرقی پٹی جہاں جابر اور مطلق العنان حکمران آج اپنے عوام کو کچلنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے' کل کو مکافات عمل کا میدان قرار پائے آخر اقتدار کو طول دینے کے لئے انسانی جانوں سے کھیلنا کب تلک"

اور دنیا بھر میں اس قسم کی حرکت کرنے والوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ کوئی عجب نہیں کہ ایشیاء کی مشرقی پٹی جہاں جابر اور مطلق العنان حکمران آج اپنے عوام کو کچلنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے' کل کو مکافات عمل کا میدان قرار پائے آخر اقتدار کو طول دینے کے لئے انسانی جانوں سے کھیلنا کب تلک۔

برما کی مثال لے لیجئے جہاں ۱۹۸۸ء سے فوجی جرنیلوں نے من مانی کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ خود پاکستان اس سے مبرا نہیں جہاں امن عامہ کے حوالے سے عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر ملزم "پار" ہو جاتے ہیں اس کے باوجود کہ یہاں جمہوری حکومت ہے۔ اسی طرح چین میں ۱۹۸۹ء کا تیانن من (Tiananmen) کا واقعہ لوگ نہیں بھولے ہوں گے۔ انڈونیشیاء میں صدر سہارتو کے ۳۰ سالہ دور حکومت میں سینکڑوں افراد بے دردی سے قتل کئے گئے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق تیمور کے مشرقی حصہ میں بھوک اور بیماری سے دو لاکھ افراد گزشتہ ۲۰ سالوں میں ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ سہارتو کے قریبی رشتہ دار ڈھیروں دولت کے مالک بن گئے ان حالات میں عوام کے جو جذبات ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں' یہ الگ بات ہے کہ جو لوگ حکومت پر قابض ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنا عوام کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

عام خیال یہ ہے کہ جب تک کسی ملک میں اتنا کچھ موجود ہو کہ حکمرانوں اور ان کے حوایوں کا پیٹ بھرتا رہے ان سے گلو خلاصی ممکن نہیں ہوتی لیکن جونہی معاشی زوال کا آغاز ہوتا ہے عوام ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے۔ طرح طرح کے سکینڈل جنم لیتے ہیں اور گزر جاتے ہیں مگر حکمرانوں کا بال بیکا نہیں ہوتا جس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کسی بھی سطح پر ایسے افراد کی کمی نہیں جو مال بنانے کے چکر میں سرگرداں ہیں۔ سڑکوں پر نت نئی گاڑیوں کی بھرمار کیا حلال کی کمائی سے ہے۔ گنتی کے کچھ لوگ ہوں گے جو اپنی دیانتداری کی سزا بھگتنے پر مجبور ہیں لیکن دولت کی یہ ریل پیل سدا رہنے والی نہیں' الا یہ کہ کہیں تیل یا سونا برآمد ہو جائے۔ وہ وقت آکر رہے گا کہ لوگ حکمرانوں کا گریبان پکڑیں گے۔ تھائی لینڈ میں ۶۳ سال کے دوران فوجی افسروں نے ۱۹ مرتبہ بغاوت کی ۱۰ مرتبہ کامیابی ہوئی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بغاوت میں ناکام رہنے والے فوجی افسر بھی اسی طرح مراعات سے نوازے گئے جس طرح کامیابی سے ہمکنار ہونے والے۔ اس سے بڑھ کر اندھیر نگری کیا ہوگی لیکن اس کے باوجود ملک میں ان کی مخالفت جاری ہے۔ ۱۹۹۲ء میں بنکاک میں آزادی کے لئے مظاہرہ کرنے والے ۵۰ افراد فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے جس کے نتیجے میں یہ جدوجہد تیز ہوئی ہے نہ کہ اس میں کمی واقع ہوئی

البتہ یہ جان لینا چاہئے کہ محض صبر اور ثابت قدمی بھی کافی نہیں۔ فلپائن کے صدر مارکوس اربوں ڈالر ملک سے لوٹ کر لے گئے مگر بعد میں آنے والی حکومت کوشش کے باوجود ایک پائی بھی واپس نہ لا سکی اس لئے کہ ان کی بیوہ امیلڈا ایوان نمائندگان میں براجمان ہیں اور ان کے قریبی ساتھی بدستور گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ چنانچہ وہاں بدعنوانیوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف جوئیو سلونگا (Javilo Salmga) کو سیول میں لوگوں کے سامنے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ قانونی جنگ سے کچھ حاصل نہیں اس سے بہت آگے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔OO